

کبھی دیکھی نہیں لی اس بنا پر ایک ندوی عالم کی اس بہت کی جو اسلاف کرام کی محنتوں کو یاد دلاتی ہو قوم و ملک کو حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے، طرز بیان صاف، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت ۸ روپے، مصنف سے ملے گی۔

### الحق الصریح مع جماعۃ التہجد والتیراج

یہ مختصر رسالہ پانچ فقہی سوالوں کا جواب ہے جسکا حاصل نشانہ ہے کہ ماہ رمضان کے علاوہ دوسرے ایام میں بھی رات کی نماز نفل یا تہجد کو جماعت کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ یا نہیں؟ ہمارے قدیم دوست مولانا مفتی ابوالطاهر ظہور احمد صاحب حال مدرس مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ نے شرح و بسط کے ساتھ تمام معتبر کتب حدیث و فقہ کے حوالوں سے انکا جواب دیا ہے، اور اس کا جواز ثابت کیا ہے، ایک خالص فقہی مسئلہ کی تحریر و توضیح میں جس میں قدم قدم پر فقہ کی عربی عبارتیں ہیں، مولف نے زبان کی سلاست اور روانی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا ہے، مقدمات کی ترتیب اور ارتباطات و تہجوں کے نکالنے میں اچھا سلیقہ تحریر دکھایا ہے، کتابوں اور حوالوں کے پیش کرنے میں دور تک نظر ڈالی ہے، ہم اپنے دوست کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر دور العلوم ندوہ کی متوسطات کی تعلیم انکی رہبر نہ ہوتی، تو کم از کم اس سلیقہ تحریر کے بجائے، مولویانہ طرز بیان کی تولیدگی ان کے حصہ میں ہوتی، جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے، انکی تحقیق نے ہر شق کو آئینہ کر دیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض مسائل میں انکے تحقیقات غلو کا ہم باسانی ساتھ نہ دے سکیں، قیمت ۳ روپے، رسالہ مصنف سے مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ کے پتہ سے ملے گا،

### نور البصر فی الکبریت الاحمر

کبریت الاحمر کبریت ام کسی درود کا نام ہے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی طعن منسوب ہے، اس کی یہ درود میں شرح علامہ ابوالبرکات محمد عبدالملک صاحب سابق مشیر ہلال بھاول پور نے تصنیف فرمائی ہے، ہمارے مشیر مال صاحب کو یہ گنج بے بہا کثیر کی ایک خالقہات سے ہاتھ لگا ہے اور جسکو انھوں نے اپنی زینبی کی بنا پر وقت عام کیا ہے، اس درود کی زبان اور ترکیب و بیان کی بنا پر ہم ہرگز تیار نہیں کہ اس کو شیخ کی طعن منسوب کرین، شیخ کے اثنائین قصیدہ غوثیہ کے اشعار بھی لائے گئے ہیں جو جو ام میں شیخ کی طعن منسوب ہے، علامہ لکھنؤ کا ترجمہ جلی ہے، قیمت ۳ روپے، مولوی ہندی بہاوالدین پنجاب،

مجلد شانزدہم ماہ محرم الحرام ۱۳۴۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۲۵ء عدد دوم

### مضایح

شذرات،	سید سلیمان ندوی،	۸۲ - ۸۴
عالم اسلامی کی تنظیم کا مسئلہ،	"	۸۵ - ۹۰
مشہور ماہر کیمیا جابر بن حیان،	جناب سردار محمد حسنین ایم سی پی آئیں،	۹۸ - ۱۱۴
دو آبہ دریائے جیحون و سیحون،	پروفیسر جلیل الرحمن ایم اے جامعہ عثمانیہ،	۱۱۵ - ۱۲۹
ڈنمارک میں علوم مشرقیہ کی تاریخ،	مولوی سید یاسر علی صاحب ندوی رفیق دارالافتاء،	۱۳۰ - ۱۳۷
سلیمان بستانی،	"	۱۳۸ - ۱۳۹
جامع عمر دین العاص،	"	۱۳۹ - ۱۴۱
مدرسہ طیبہ مصر،	"	۱۴۱ - ۱۴۲
اجتہاد علمیہ،	"	۱۴۵ - ۱۴۸
ادبیات،	عزیز - ادبی،	۱۴۹ - ۱۵۰
صدنیات،	مولوی سید مقبول احمد صاحب ایم آر آئیں،	۱۵۱ - ۱۵۷
مطبوعات جدیدہ،	"	۱۵۸ - ۱۶۰

### سیر النصار

سیر النصار کا وہ حصہ جس میں انصار کرام رضی اللہ عنہم کے سوانح و حالات اور ان کے فضائل و کمالات مستند ذرائع سے بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہیں، ضخامت ۳۶۵ صفحہ، قیمت ۸ روپے، "پنیر"



## شبستان

دارالعلوم ندوۃ کے تعلیم یافتہ علامہ مین مولانا مفتی محمد لوسیٹ صاحب بہاری ایک لائق فاضل تھے انھوں نے ہفت گزشتہ کو باریشہ فیج لکھنؤ میں انتقال کیا، وہ ندوی علماء میں فنون ادب عربی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، فراغت کے بعد اپنی زندگی دارالعلوم پر وقف کر دی تھی، اور اس وقت وہ ان ادیبوں کے عہدہ پر ممتاز تھے، باوجود اس کے کہ ان کو دوسری جگہ پیش قرار تنخواہ میں ملتی تھیں تاہم انھوں نے جس خلوص اور ایثار سے تقریباً دس برس مدرسہ کی خدمت کی وہ تعریف و ستائش کی مستحق تھے، وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے خدمات ادا کر رہے تھے، عربی رسائل میں ادب کے مضامین شائع ہوتے تھے عربی خوان طلبہ کی سہولت کے لیے شبلی بکڈپو کے نام مصری مطبوعات کی ہم رسانی کا کام بھی انجام دیتے تھے انھوں نے ان کی جوانمردی نے ہماری صف میں ایک نام برپا کر دیا، اور مدرسہ نے اپنے ایک لائق فرزند کے ساتھ اپنے ایک فاضل مدرس کو کھو دیا، خادم مرحوم کو جو ارجمت میں جگہ دے، مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم کی وفات کے بعد ہماری برادری میں یہ درد سرا صبر آزمائے پیش آیا ہے، مسلمانوں میں جو قحطِ رجال ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان نو خلائق چمن کی بے وقت پژمردگی کس قدر حسرت ہے،

حسرت ان غنچوں پر جو بچن کھلے مچھائے



واللہ اعلم ندوۃ اعلیٰ کی تعمیر کے لیے فراہمی سرمایہ کی جو اپیل بننے قوم کے سامنے پیش کی تھی، خدا کا شکر ہے کہ اس نے درمند دونوں کو اس سے متاثر کیا، اور باوجود اس کے کہ اب تک مہولوں میں کام کرنے والے سپرد انہیں ہوئے ہیں، لوگوں نے خود اپنی طرف سے پیش قدمی شروع کر دی ہے، دروازے پر

جو سائل آجائے اسکو ردی کا ٹکڑا تو ہر شخص دیکھ کر ماننا چاہتا ہے مگر ایسے سخی داتا کم مین گے جو خود سائل کی تلاش میں گھر سے نکل پڑیں، اور انکو دھونڈ کر خیرات دیں، اس سلسلہ میں سندھ کے سیٹھ عبداللہ ہارون کے ٹوٹھائی سو روپیوں کے بعد بلوچستان کے دوست کوٹری کے مسلمان کارکنوں کی ہمت قابلِ ستائش ہے جنھوں نے بلا سوال اس دور دراز علاقہ سے پانچ سو تیس روپیے کی رقم خود بخود ہمارے پاس بھیج دی، اسی طرح ڈیرہ غازی خان سے احسان الحق صاحب دسٹرکٹ جج نے صد روپیے بھیجے ہیں، شیخ قیصر علی صاحب ایک بزرگ نے صد روپیوں سے بھیجے، خدا ان نفعین کو جزائے خیر دے،

صوبہ بہار میں مین نے خود دو تین شہروں کا دورہ کیا، بہار شریف، پٹنہ، چھپرہ، موتیہاری بنیا، انھیں شکر کہ ہر جگہ ندوۃ کے مددگار اور ہمارے قدر دانوں کی کافی جماعت ملی، خلافت کی تحریک کے باعث ہر جگہ چند نفع خادمان اسلام پیدا ہو گئے ہیں، جو ہر مفید مذہبی و قومی تحریک کو کامیاب بنانا اپنا فرض جانتے ہیں، ان افراد سے ہر جگہ ہم کو گرانقدر مدد ملی، اس سفر کا نتیجہ ہزار سرمایہ کی فراہمی ہے، جن میں سے دو ہزار نقد وصول ہو چکے ہیں، البقیہ رقم بھی انشائے جلد وصول ہو گی، چوتھو نمبر میراعزم ایک علمی و دینی خدمت کی غرض سے ستمبر و اکتوبر میں مدراس کے قیام کا ہے، اسلئے یہ دورہ بالفصل ملتوی کر دیا ہے، جاڑوں میں عنقریب صوبہ بہار کا بقیہ دورہ انشائے جلد ختم ہوگا، امید ہے کہ درمند اصحاب اس وقت ہماری مدد دریغ نہ فرمائیں گے، کہ یہ مدد ہماری نہیں بلکہ خود ان کی آپ مدد ہے،



اعلامی مہم میں ہمارے دوست مولانا مسعود علی صاحب ندوی، مولانا شوکت علی صاحب کی مسیت و فاقہ میں دارالعلوم کے لیے فراہمی سرمایہ کا کام انجام دے رہے ہیں، یہ دونوں قوم کے مشہور پھر کاری ہیں، دورانِ تحریک خلافت میں کہیں ان دونوں نے ملکر کچا وصولی چندہ کا کام



نہیں کیا اور دونوں اپنی جگہ پر اپنے اپنے مرتبہ منصب کے مطابق کامیاب رہے اب جبکہ اس موقع پر یہ دونوں مشہور قومی سائل ایک صف اور دوش بدوش ہو کر قوم پر حملہ آور ہوں تو خدا مہربانی کے دو ہمت مند مسلمانوں کے اپنی صند و قون کو ان میں رکھے، ہم کو امید ہے کہ احاطہ کئی مین دہ انہار کی خفیت رقم جو وہاں کا ایک انی مسلمان سوداگر اپنی طرف سے ادا کر سکتا ہے اس کی فراہمی میں وہاں کچھ زیادہ وقت پیش نہیں آئے گی،

مسلمان حید جو چند دن کے بھار کے شاکی مین لیکن ذرا اپنی ہمسایوں اور ہوطنوں کی طرف ایک نظر ڈالیں، وہ کونسا کام ہے جس پر مسلمان خرچ کر رہے ہیں اور اسی قسم کے کاموں پر وہ ان سے زیادہ خرچ کر رہے ہیں، اپنی یونیورسٹی ہے تو ادنیٰ بھی ہے آپ کے ایک کالج میں تو اُنکے دس پانچ مین، آپ کے چند اسکول میں تو ان کے بیسیوں مین، آپ کے صد ہا مذہبی مدرسے میں تو ان کے بھی سینکڑوں پائٹ شلے اور گرول مین، اپنی تبلیغی انجمن میں تو انکی بھی شدھی بھائی مین، اس کے علاوہ گورکھشا، عقد بیوگان، سیوا سبھی، ہندی سمیٹن وغیرہ بیسیوں ایسی انجمنیں ہیں، جنکے ماہوار دس لاکھ اخراجات ہندو قوم پورے کر رہی ہے۔ گروکل مین ایک ایک سال کا چند ایک ایک لاکھ ہو گیا ہے، کیا کسی اسلامی مذہبی مدرسہ کو یہ دن نصیب ہوا ہے، ہندی سمیٹن کے متعلق سنا ہے کہ چار پانچ ہزار ماہوار اسکا خرچ ہو گیا انجمن قومی، اردو اور دارالمصنفین کو اس کا نقد قسم کا قائل بھی ہو سکتا ہو، بنارس کے صرن ایک دو لکھ ہندو نے دس لاکھ کی رقم اس کے لیے عطیہ کر دی ہے، ہمارا جامعہ ملیہ کوڑیوں کو محتاج ہے، مگر دیا پٹھ بنارس صرن ایک ہندو رئیس کی فیاضی اسکی بقا کی ضمانت کر رہی ہے،

کہتے ہیں کہ مسلمان اپنے اسلام کی قد دانی میں سب سے آگے ہیں مگر اس کا عملی ثبوت کیا ہے؟ سرسید کی یادگار مین کے لاکھ وصول ہوئے، ادا کئے سال مین ہوئے، محسن الملک، وقار الملک، عالی،

شبلی کی یادگار دن کے لیے قوم نے کام کرنے والوں کی اپیلوں کا کیا جواب دیا، مگر اردو سر دیکھو داس کو مرے ہوئے دو جینے بھی نہیں گزے، مگر انکی یادگار کے دس لاکھ روپے کے مطالبہ مین سے سالا لاکھ اس عرصہ مین جمع ہو چکے،

چند دن اور قومی سرمایہ مین نصرت کا اعتراض اکثر اٹھایا جاتا ہے، عارضی اور جنگامی اور عمومی غیر ذمہ دارانہ کاموں مین یقیناً بے احتیاطیان ہوئی ہیں، ہوتی ہیں اور ہونگی، اور اس مین ہندو مسلمان دونوں یکساں ہیں، مگر ایک کا طرف یہ ہو کہ اجارات قومی مجلسوں اور انجمنوں مین بھی اُنکے تذکرے نہیں آنے دیتے، دوسرے کا حال یہ ہے کہ واقعہ کسی قدر اتفاقی ہو، مگر اسکی تشہیر گھر گھر اور دور دراز کیجاتی ہے، اور اس طرح بیسیوں قومی کاموں کو حد پر پہنچ رہا ہے، ہماری مذہبی، قومی تعلیمی انجمنیں اور درس گاہیں جو سالہا سال سے کام کر رہی ہیں بھگتد کہ اس خردہ گیری سے پاک ہیں، لیکن بائینہ ان کی ایمانداری کی قدر نہیں کیجاتی،

دوسرا جواب اس موقع پر یہ دیا جاتا ہو کہ مسلمانوں کی قوم غریب ہی ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر اسے کاش انکی اس غربت کا اظہار انکی غم و مسرت کی تقریبوں پر بھی ہوتا، شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی ہوتا، روزانہ زندگی کے مصارف مین بھی ہوتا، رہنے سہنے کے اخراجات مین بھی ہوتا، اس کو چھوڑ کر نسبت دونوں قوموں کی تاریکی مین جو وہ نسبت قوموں کے دو ہمت مند چند دن اور عطیوں مین ہوتی، فرض کر دو کہ نئی سیاسی اور سماجی تحریکیں جن سے ہمارے دو لکھ امراء گھبراتے ہیں اگر وہ ان کے نزدیک خطرناک ہیں تو تعلیم، تبلیغ، عت تعلیم کے مقاصد تو ایسے خطرناک نہیں، اگر گورنمنٹ کے گوشہ التفات کا خیال ہے تو جامعہ ملیہ ہی مسلم یونیورسٹی تو مستثنیٰ ہے بے نیاز ہو جاتی مگر بیان تو دونوں کو برابر کا شکوہ ہے،



مسلمانوں کو اگر ہندوؤں کا مقابلہ کرنا ہے اور کرنا چاہیے اور کرنا پڑیگا، تو وہ شور و غل، گالی گلوچ، مار پیٹ، دنگ و فساد، لعن طعن، بدظلم، اور بددستی میں بہنیں کہ ان سے قوم نہیں بنتی، بلکہ متانت، سنجیدگی، وقار، خاموش کام، پرسکون عمل، صبر و استقلال، قومی فیاضی، قومی حضائل کی حفاظت، قومی کاموں کی سچائی اور ذاتی کفایت بخاری، اخلاص کے ساتھ مدد پہنچے قومی و مذہبی خادموں کی عزت و احترام اور ان کے آواز پر جلد از جلد مستعدی میں کہ ان سے قوم بنتی ہے،

✽

آج ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتاؤ کہ مسلمانوں میں کوئی ایک ایسا مرکز ہے جسکی پکار پر مسلمانوں کا سوا و غم لبیک کہنے کو تیار ہو، پہلے علیحدہ کا بتانا تھا، وہ لوٹا تو خیال ہوا کہ اب اسکی جگہ ایک متحدہ قہر تیار ہوگا کچھ دنوں تک یہ امید قائم رہی، مگر پردہ الٹا تو نظر آیا کہ اب ایک بتانے کی جگہ سینکڑوں بتانے ایک خود مختار شنشائی کی جگہ بیسیوں طوائف الملکیان، الگ الگ پیدا ہو گئی ہیں، ان کو جس قدر مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے اتنا ہی افراق اور پیدا ہو جاتا ہے، آل پارٹیز کانفرنس سے امید اتفاق کی تھی تو وہ اتفاق کی صورت بن گئی، جمعیتہ العلماء الگ ہو گئی اور مجلس خلافت ناظرہ رنگینی، جمعیتہ تنظیم نام ایک اور عالمگیر انجمن وجود پذیر ہو گئی، کیا عالمگیر مذہب کے ماننے والوں کو عالمگیری کے سوا اور دوسرا کوئی خواب کھائی نہیں رہتا، اور ان کا کوئی کام اس سے کم مرتبہ سے شروع نہیں ہو سکتا، ابھی ہماری انجمنوں کا جو بھی نہیں ہوتا کہ وہ سارے عالم کو اپنے اندر گھیر لینا چاہتی ہیں، اور سعدی کے مشہور مقولہ کی بنا پر "دو بادشاہت در آہیے نہ گنجد" تو ان کاموں اور کام کرنے والوں میں تصادم شروع ہو جاتا ہو ورنہ اگر اپنی اپنی حد کے اندر لوگ کام کریں تو وہ دو دینے بجلیے خستہ۔ والسلام و مسلمانان بیا سائند،

✽

دائرة المعارف جدید آباد سے علمی حلقوں کے لیے ایک دل خوش کن بشارت کی اطلاع ملی ہے

یعنی بہرام رازی کی سب سے اہم فلسفیانہ تصنیف **مباحث مشرقیہ** کی جلد اول چھپ کر تیار ہو گئی، مصنف نے تو ایک ہی جلد میں کتاب لکھی ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ واکرہ نے ضخامت کے خیال سے دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے، یہ کتاب جب پوری چھپ جائے تو ہم عربی مدارس سے توقع کرینگے کہ وہ متاخرین ہند کی عقلی تصنیفات و تعلیقات کے بجائے اس کو اپنے نصاب تعلیم میں داخل کرینگے

یاد ہوگا کہ **ندوۃ العلماء** کی تجویز کے مطابق مولانا **شبلی** مرحوم کی تحریک سے جناب نواب عماد الملک بگرامی نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا، اور مولانا کا انتقال ہو گیا، اور ادھر سالہا سال سے نواب صاحب ممدوح کی صحت جواب دے چکی ہے، اس لیے یہ کام رک گیا، ہم کو یہ خیال آیا کہ اس کام کو پھر اٹھایا جائے، مترجم ممدوح نے، پارہ دن تک کا ترجمہ کیا ہے، سورہ نحل تک بقیضہ مکمل ہے، ترجمہ کی انگریزی زبان کا کیا کتا، مگر ضرورت ہے کہ لائق انگریزی دان علماء اس کی معنوی صحت و سقم کو دیکھ لیں، پھر مشورہ طلب یہ امر ہے کہ یہ سادہ ترجمہ ہے، آیا اس کو اسی طرح چھاپا جائے یا اس میں حواشی کا اضافہ کیا جائے، موصوف نے ازراہ عنایت اپنا مہیضہ ہماری طلب پر ہلکے بھجوا دیا ہے،

✽

**سچ** کے نام سے جو ہفتہ دار اصلاحی صحیفہ لکھنؤ سے نکل رہا ہے اور جس نے مقوری ہی مدت میں اپنی سچائی، اعتدال، ناظر فداری، سچی مذہبی اسپرٹ کی بدولت خواص میں غیر معمولی ہرگز نری حاصل کر لی ہے اور جس میں ہمارے فاضل و دوست مولوی عبدالماجد صاحب بی لے اور مولانا عبدالرحمن صاحب بگرامی ندوی اپنے فاضلانہ خیالات سیدھی سادھی عبارت میں ادا کیا کرتے ہیں اور مسلمانوں کو اعتدال کے ساتھ معنی خیالات سے آشنا کیا کرتے ہیں، اس لائق ہے کہ مسلمان اس صحیفہ کی پوری قدر کریں، اور خریداری سے اسکی حوصلہ افزائی کریں، اسکی سالانہ قیمت تین روپیہ ہے



# مقالہ

## عالم اسلامی کی تنظیم کا مسئلہ

اور

### مسلمانوں کا انتشار خیال

مسلمانوں کے روز افزون انحطاط، پراگندگی، اور انتشار کا سلسلہ صدیوں سے قائم تھا، مگر چونکہ دولت عثمانیہ کا سایہ بہت مدت تک دنیا کے مسلمانوں کی تشفی کا باعث تھا، اور خالص اسلامی ممالک ایک زنجیر میں گودہ کسی قدر کمزور ہو دالہ نظر آتے تھے، اس لیے عام مسلمانوں کو اپنی اس کمزوری اور ضعف کا احساس نہ تھا اور وہ اپنے کو ایک رشتہ میں منسلک سمجھتے تھے، اس جنگ عظیم کی بدولت اس سایہ کا ہٹنا اور اس زنجیر کا ٹوٹنا تھا کہ اس فریب کی حقیقت واضح ہو گئی، اور معلوم ہو گیا کہ مسلمان ایک بڑے دھوکے میں مبتلا تھے، ترکی کے انقلاب اور جبریت کے قیام اور فعلی خلافت کے عزل نے اس دھوکے کا دھوکا ہونا اس طرح آشکارا کر دیا کہ کسی سمجھدار مسلمان کو اس میں شک نہیں رہا،

اب روئے زمین کے کسی مسلمان کو اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا قعر خواب و خیال ہے اور انکی باہمی وابستگی، ہم رشتگی، اور جامعیت کا وجود سراب سے بھی زیادہ بے حقیقت ہے اسی کے ساتھ اس کا بھی سب کو یقین ہے کہ اسلام کی فطرت مقتضی ہے کہ اس رشتہ کا وجود قائم اور اسلامی برادری داخلہ کی شیرازہ بندی باقی رہے، مذہبی ہدایتوں کے علاوہ

دنیاوی سیاستوں اور حکومتوں کا تقاضا بھی یہ ہے کہ مسلمان قوموں کو بحیثیت مسلمان کے دنیا کی قوموں کے سامنے زندہ اور باقی رہنے کے لیے، مسلمانوں کا متحدہ محاذ اور انکی برادری جمعیت قائم رہے،

اسلام کا اصول اس کا بھی مقتضی ہے کہ تمام دنیائے اسلام میں مسلمانوں کا ایک مذہبی پیشوا اور امام ہو،

اس کا واحد وجود تمام دنیا کی مسلمان قوموں کے لیے رشتہ اتحاد اور رابطہ وحدت کا کام دے، اور مذہبی شعائر

و احکام کی نگہداشت اور اجراء کا فرض انجام دے، اس کا امام خواہ تم خلیفہ رکھو، امام رکھو، یا امیر المؤمنین رکھو،

اس حقیقت سے کون بے خبر انکار کر سکتا ہے کہ یہ خلافت و امامت اپنے اصلی مہناج اور شرائط و آداب

سے بہت جلد ہٹ گئی، تاہم بغداد کی تباہی تک کچھ نہ کچھ اسکی حیثیت تھی، اور قاہرہ میں جا کر اسکی حیثیت کو خود

دارالخلافہ میں کچھ نہ رہی، تاہم دور دراز کے اسلامی ملکوں میں خلیفہ عباسی کی یہ مصری خانقاہ بھی عقیدت

عامہ کا مرکز تھی، ان گزشتہ چند صدیوں میں جب دولت عثمانیہ کے سوا کوئی آزاد اسلامی حکومت باقی

نہیں رہی تو لامحالہ یہ عقیدت کی کشش، قاہرہ سے قسطنطنیہ کو منتقل ہو گئی، کون نہیں جانتا کہ اسلام وہ

مذہب ہے جو مذہب اور سلطنت ساتھ ساتھ بنا، اس کا امام ہی اسکا بادشاہ تھا، اسکی ایک ہی عبادت گاہ

کی چار دیواری اسکی مسجد بھی تھی اور اسکی عدالت گاہ اور دربار بھی، اسکی ایک ہی چند زینوں کی لکڑی اسکا

منبر بھی تھا اور تخت حکومت بھی، اس کے وہی جان نثار اس کے داعی اور مبلغ بھی تھے، اور حجاب

اور سپاہی بھی اس کے وہی عہدہ دار حکام اور اہلکار بھی تھے، اور قاضی، اور امام بھی، اس دینی اور دنیوی اقتدار

و تنظیم کی وحدت کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کی دینی و دنیوی تنظیم کے الگ الگ عہدے اور دائرے نہ تھے،

اس بنا پر یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی تنظیم، ادنیٰ سیاسی تنظیم سے الگ کوئی شے نہ تھی، ایسی حالت

میں مسلمانوں کی سیاسی تباہی ادنیٰ مذہبی بے تربیتی کے ہم معنی ہے، جب کسی ملک میں مسلمانوں

کی سلطنت نہ رہی، ادنیٰ ہر قسم کی تنظیم بھی رخصت ہو گئی نہ کوئی ان کا امام رہا نہ کوئی مذہبی صیغہ رہا، نہ

اوقات کا انتظام رہا، نہ مسجدوں کی نگرانی رہی نہ مدرسوں کی دیکھ بھال رہی، نہ تبلیغ و اشاعت کا سامان



رہا اور مسلمانوں کے مذہبی مقدمات اور فیصلوں کی کوئی صورت رہی نسل آدم اور اولاد ابراہیم کی منظم  
باقاعدہ جمع جانوروں کے گچے بن گئی

جن ملکوں میں اچھی یا بری اسلامی حکومتیں قائم ہیں اور پ کے دیکھا دیکھی وہاں کے ذمہ دار  
ارکان سیاست اور ارباب فکر میں یہ خیال قائم ہوتا جاتا ہے کہ دینی و دنیاوی طاقتوں کی یکجائی اور  
مذہبی و سیاسی تنظیموں کی وحدت اور ان کی ترقی کی راہ میں حائل ہے یہی خیال ہے جس نے ترکی کے  
مجاہد عظیم مصطفیٰ کمال اور ان کے رفقاء کے کار کو عزل خلافت پر آمادہ کر دیا اور اسی کی نقل اور آواز  
بازگشت و دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی سنائی دیتی ہے

یورپ کو جب ہوش آیا ہے اور سمجھا ہے کہ اتحاد اسلامی ہی کی قوت ہے جو اسکی قوت  
کا مقابلہ کر سکتی ہے مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ کر سکتی ہے اور ان کو دوبارہ مضبوط اور زندہ بنا  
سکتی ہے اور اس اتحاد اسلامی کی بنیاد خلافت کا وجود ہے مختلف طریقوں سے اسکی قوت کو توڑنے  
کی کوششیں کی جا رہی ہیں یورپ کے تیغ زن سپاہیوں نے اپنی تلوار دن سے اور مصنفین نے اپنے  
قلم سے اس کے منانے کی پوری کوشش کی یونان و روم کی جنگ پہلا موقع ہے جب یورپ میں طاقتوں  
کی متفقہ خواہش کے خلاف دنیا کے اسلام میں خلیفہ عثمانی کی ہمدردی و مالی اعانت کے غیر معمولی  
جذبات نے یورپ کے قانون میں خطرہ کی گھنٹی بجا کر اسکو متنبہ کیا

بعض یورپین اہل قلم نے یہ کیا کہ خلافت اسلامیہ کو اصول اسلام کی حیثیت سے تو تسلیم کر لیا  
مگر بعد اسلام بنکر انھوں نے پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کو انکی ایک عظیم الشان غلطی پر متنبہ کیا  
کہ الائنمنٹ من قریش ترک اس کے مستحق نہیں ان کو مٹا کر مغلطہ کی چار دیواری میں عربی ہاشمی  
خلافت قائم کرو اس جماعت کے سرگروہ مشہور مجدد اسلام بلنت تھے دوسروں نے ترکوں کے شرعی  
خلیفہ ہونے سے بحیثیت مفتی اسلام کے انکار کیا یہ سب کچھ ہوتا تھا اور ہم کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے

اس جنگ عظیم میں منصب خلافت کی اہمیت کم کرنے بجائے اس کے منادینے کی سب سے زیادہ ضرورت پیش  
آئی اور خلافت کی حیثیت سے جس ہفتہ ہم انگلستان پہنچے ہیں سب سے پہلے ایک اعلیٰ مستشرق کا جو  
یونیورسٹی میں تاریخ اسلام کے پروفیسر تھے سالہ "دی نیچر آف دی خلافت" کا انگریزی خلاصہ نظر سے گذرا  
اور جسکو اٹلی کی حکومت میں یہ اہتمام حاصل تھا کہ اٹلی کی وزارت خارجہ نے اسکو اپنی طرف سے شائع کیا  
اور اس کے بعد سلطان ایزائے خلیفہ کا دوسرا شکا نہ مصنفوں ایک انگریزی اہل قلم نے لکھا اس کے بعد  
تیسرا مصنفوں پروفیسر مارکیو لیو تھے نے ادنبرور لندن میں مسئلہ خلافت کی تاریخی کمزوری پر لکھا

ہندوستان میں خلافت کی تحریک نے جو زور شور اور اہل چل پیدا کی اسکی سیاسی اہمیت نے یورپ  
کو اور زیادہ ڈرا دیا تلوار کا وقت نکل چکا تھا اس لیے سپاہیوں نے ہنگر اہل قلم حضرات کے لیے جگہ  
خالی کر دی اور انھوں نے اس وقت سے برابر مسئلہ خلافت کی تحقیق و کاوش اسکی شکست اور رنجیت یورپ سے متاثر  
دماغوں میں اسکی مذہبی نامعتبری تاریخی کم اہمیت اور اس کے سیاسی نقصانات اور تمدنی خرابیاں اس  
طرح آشکارا کیں کہ خود مسلمانوں میں سچوں بعض افراد کو اس کا یقین آنے لگا جو یورپ کے مصنفین کو  
بنائیت معصوم مخلصانہ اور ہر قسم کے سیاسیات سے بلند جانتے ہیں

قاصد رقیب بودہ دمن غافل از فریب

بیدر دمدعائے خود اندر میانہ ساخت

نتیجہ یہ ہوا کہ جنگی خلافت کے لیے دنیا لڑ رہی تھی انھیں نے خود اپنے ہاتھ سے اسکو دفن کر ڈیا  
اور اس کو مٹا کر وہ سمجھے کہ انھوں نے اپنی قومی حکومت کے سامنے سے سارے عواقب ہٹا دے اور تسلیم کر لیا  
کہ دین و دنیا کا اختلاط اور مذہب و سیاست کی آمیزش اسلاف کی سب سے بڑی غلطی تھی جسکو انھوں نے  
دور کر دیا اور یہ فعل بعینہ اصول اسلام کے مطابق ہے ترکوں کے اس عمل نے گویا یورپ میں پروگنڈے  
کو جو بدقون سے خلافت کے متعلق مسلمانوں میں جاری تھا دفعہ کامیاب کر دیا اس پر بھی ہمارے



دشمنوں کو چین نہیں آیا اور اب ترکوں کے اس فعل کی تحقیر کا پروگنڈا جاری ہے لندن یونیورسٹی میں مسئلہ خلافت کی تاریخی اسناد پر بحث کرنے کے لیے ہمارے مشہور پروفیسر آرنلڈ کو مقرر کیا گیا، ڈاکٹر آرنلڈ نے اس بحث پر ایک جیسوٹا لکھ دیا، اور گزشتہ سال ۱۹۷۲ء میں دی خلافت کے نام سے دو سو صفحوں میں انھوں نے اس مسئلہ کے تاریخی پہلو پر ۱۱ بابوں میں مفصل بحث کی،

اس کتاب میں نہایت کاوش اور محنت سے ڈاکٹر آرنلڈ نے اس منصب خلافت کے آغاز سے اور اس کتاب میں نہایت کاوش اور محنت سے ڈاکٹر آرنلڈ نے اس منصب خلافت کے آغاز سے اور اس کی تاریخ کو کی کیا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اس منصب کے ضروری اخیر ترکیب کے ہر قسم کے واقعات کو کی کیا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اس منصب کے ضروری اور اصول اسلام میں سے ہونے پر قرآن و حدیث سے کوئی استدلال موجود نہیں ہے، نیز تاریخ اسلام بھی اسکی تائید نہیں کرتی نہ خلافت راشدہ کے بعد اس منصب کو مسلمانوں نے عملاً تسلیم کیا اور خصوصاً ترک سلطان تو اس حیثیت سے کبھی مسلم ہوئے ہی نہیں،

اختیار جو کچھ کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں اس ذکر کو جانے ہی دیجئے، یہ دیکھئے کہ خود اپنوں کا اس مسئلہ کے متعلق کیا خیال ہے اب اہل مسئلہ قابل غور یہ ہے کہ مسلمانوں کی تنظیم اور وحدت کا فرض کس طرح انجام دینا چاہیے، کہ مسلمانوں میں از سر نو طاقت و قوت اور نظام و اتحاد پیدا ہو، ترکیب میں عزل خلافت کے موقع پر جو تقریر لگائی، اور اسی کے ساتھ ترکیب زبان میں مسئلہ خلافت پر جو کتاب "خلافت و حاکمیت ملیہ" لکھو اگر عام طور سے شائع لگائی، اس میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ خلافت کوئی مذہبی اور روحانی منصب نہیں، نیز خلافت کے لیے وجود شخصی ضروری نہیں، خود حکومت اور مجلس خلافت جمہوری ہے اور اسی سے مسلمانوں میں تازہ قوت اور نئی طاقت پیدا ہوگی،

علامہ مصر میں سے سید رشید رضا نے ائمہ ائمہ اکبر جی ایک خاص کتاب ۱۳۲۱ء میں لکھنے شائع کی ہے، جس میں انھوں نے خلافت اسلامیہ کے آداب، شروط، مصالح اور فوائد بتائے ہیں اور جدید ترکیب اور تعلیم یافتہ مسلمانانِ ہندوستان کو یہ بتایا ہے کہ خلافت اسلامیہ کو جدید ترکیب

میں شرع صحیح کے اصلی مقصود کے مطابق از سر نو ملک عرب میں قائم کرنا چاہیے، اور اسی سے دنیا اسلام میں نئی زندگی پیدا ہوگی، خلیفہ انتخاب سے منتخب ہو اور اس کے ساتھ ایک مجلس شوری ہو، جسکی اعانت اور شوریہ سے وہ تعلیمی، تبلیغی، تشرعی احکام و مصالح تمام اسلامی ملکوں میں پھیلائے اور ہر اسلامی ملک میں اس کے باقاعدہ نائبین ہوں،

اس مسئلہ کے متعلق حسب ذیل ادنیٰ تجاویز ہیں،

۱۔ ایک عظیم الشان اسلامی مذہبی درسگاہ کا قیام جس میں مجتہدین اور مذہبی مقتنین پیدا ہوں، جو ضروریات زمانہ اور اصول اسلام کے مطابق نئے احکام استنباط کریں اور اسلام و تمدن میں باہمی آمیزش کے بجائے آمیزش پیدا کریں،

۲۔ خلیفہ کا انتخاب،

۳۔ خلافت کے انتظامی اور مالی صیغے اور اسکی حسب ذیل ماتحت مجلسیں،

۱۔ مجلس شوری

ب۔ مجلس افتاء و تصنیف و نگہ رانی مولفات دینی

ج۔ مجلس جو حکام، قاضیوں، اور مفتیوں کو احکام دے،

د۔ مجلس جو حکومت کی عام نگرانی کرے،

۴۔ مجلس اشاعت اسلام،

و۔ مجلس جو مساجد کے خطیبوں، اماموں، اور واعظوں کی نگرانی کرے،

۵۔ مجلس زکوٰۃ،

۶۔ مجلس حجاج و خدمت حرمین شریفین،

۷۔ مجلس مراسلات،



سید رشید رضا صاحب کا میلان خاطر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خلیفہ دینی اور دنیاوی اقتدار کے ساتھ عرب میں قائم کیا جائے، جہاں تک اس کے حدود حکومت کا تعلق ہے وہ خلافت کے ساتھ دنیاوی حکمران بھی ہو، اور دوسرے اسلامی ممالک میں اس کو صرف روحانی خلیفہ تسلیم کر کے اس کی اطاعت مذہبی احکام میں کی جائے،

مصر میں ازہری علماء و مشائخ کا بھی یہی خیال ہے، لیکن وہ خلافت کے مرکز کو عرب کی بجائے مصر میں رکھنا چاہتے ہیں، اور عجب نہیں کہ ان کے دل کے اندر کی یہ خواہش ہو کہ مصر کی سلطنت پچھلے زمانہ کی طرح پھر شام و عرب پر محیط ہو جائے اور اس طرح مقامات مقدسہ کی حفاظت و حمایت کا شرف بھی مصر کو منتقل ہو جائے، اس تحریک کی تبلیغ ادنیٰ طرف سے تقریباً دو سال سے جاری ہے، تمام سرکاری علماء آئین یورپی و کپسی نے رہے ہیں، مولانا خاں جامع ازہری و فتری عمارت میں قائم ہے، ایک ماہوار رسالہ اس مقصد کی اشاعت کے لیے جاری ہے، اور وہ تمام اسلامی ممالک میں مفت تقسیم ہوتا ہے، اس مصری تبلیغ کا اثر تمام اسلامی ممالک میں سے جاویدین زیادہ پڑ رہا ہے

ابھی حال میں مشہور اسلامی مبلغ اور اتحاد اسلامی کے داعی مولوی برکت اللہ صاحب بھوپالی نے جنھوں نے اب مشرق کو چھوڑ کر پھر مغرب کو اپنا مرکز بنایا ہے، خلافت نام ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے جس میں اس مسئلہ پر اپنے خیال کے مطابق جرح و ثبوت کی بحث کی ہے، اور اس منصب کے قیام اور فرائض کے متعلق پورا خاکہ اور نقشہ عمل پیش کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے، کہ خلافت اسلام کا نہایت ضروری اصول ہے، لیکن ضرور ہے کہ آئندہ خلیفہ صرف دینی و روحانی امام ہو اور اس کو سیاست و حکومت سے کوئی تعلق نہ ہو، اس کا کام صرف یہ ہو کہ وہ دوسرے زمین پر پرانہ مسلمانوں کو ایک تعلیمی نصاب میں منسلک کرے، اور اسلامی مبالغین دنیا کے گوشوں میں بھیجے اور جو لوگوں کو ذاتی اخوت اور دینی بڑائی کی دعوت دے، اور ایسی تاریخی کتابوں کی تصنیف کے لیے ایک مجلس قائم کرے

جن سے اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات اور غلط فہمیاں دور ہوں،

اس خلیفہ کے ماتحت، اسلامی جماعتوں کے ایسے نمایندگان کی ایک مجلس شوری ہو جو اپنی اپنی جماعت کی طرف سے منتخب ہو کر دار الخلافہ میں بھیجے جائیں، خلیفہ اس مجلس کا صدر ہو اور یہ مجلس شوری مسلمانوں کے مذہبی معاملات اور روحانی ریاست کے احکام انتظامی کے فیصلہ کے لیے آخری عدالت ہو ہر محلہ کی مسجد اس محلہ کا صدر و دفتر ہو، اس محلہ کے صدقات اور اوقاف وغیرہ کا انتظام اس محلہ کے مسلمانوں کی منتخب جماعت کے ہاتھ میں ہو، اور یہ محلوں کی مجلسیں، پورے دیہات یا شہر کی اسلامی مجلس کے ماتحت ان صدقات و اوقاف کے علاوہ دیگر مالی انتظامات سلطنت کے فرائض ہونگے، خلیفہ کے انتخاب کے بعد دنیا کے تمام شہروں اور گاؤں کے صدقات اور اوقاف کی آمدنیان خلیفہ کے پاس بھیجی جائیں گی، اور وہ ان سے وہ پھر حسب ضرورت سورہ توبہ کی اوس آیت کے مطابق جس میں صدقات و زکوٰۃ کے مستحقین کی تفصیل ہے وہ رقم خرچ ہوگی،

مولوی برکت اللہ صاحب بالفعل سونیئر لینڈ میں مقیم ہیں، وہاں سے اپنے ان مقاصد کی اشاعت اور مسئلہ خلافت کے متعلق اپنی تجاویز کی تبلیغ کے لیے عربی زبان میں اصلاح نام ایک بی رسالہ جنھوں نے ذوالعقدہ سن ۱۳۸۵ مطابق جون ۱۹۰۵ء سے شائع کرنا شروع کیا ہے، مولوی صاحب کی کتاب خلافت انگریزی سے فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکی ہے، اب عربی اور ترکی میں اس کے ترجمہ کی کوششیں ہیں، اور تجویز ہے کہ اس کا ترکی ترجمہ تمام ترکی میں تقسیم کیا جائے، ممکن ہے کہ مولوی برکت اللہ صاحب کے ساتھ سونیئر لینڈ کے دیگر پرچوش احرار مسلمان بھی ہوں جو وہاں بے غامدان ہو کر مدت سے مقیم ہیں، ابھی پچھلے مہینہ کی ڈاک سے مصر سے ایک نئی تصنیف، ایک مصنف نے ہدیہ بھیجی ہے، کتاب کا نام "الاسلام و اصول الحکم" (اسلام اور اصول سلطنت) ہے جس کے نیچے یہ لکھا ہے کہ اسلام میں خلافت و حکومت کے نظریہ پر ایک بحث، اس کتاب کے مصنف جامع ازہر کے ایک تعلیم یافتہ اور محکمہ شرعیہ کے



ایک قاضی شیخ علی عبدالرزاق ہیں۔ ابھی اسی سال ۱۹۲۵ء میں یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے تمام مذکورہ بالاکتابوں کو جو مسئلہ خلافت کے متعلق لکھی گئی ہیں پیش نظر رکھا ہے، یعنی اختلافہ والا امامہ العظمیٰ، مصنفہ سید رشید رضا، خلافت و حاکمیت علیہ ترویج عبدالغنی سنی بک، دی خلافت ڈاکٹر محمد اور دی خلافت مولوی برکت اللہ بھوپالی،

قاضی صاحب نے بالکل نئی بات پیدا کی ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت "یعنی جانشینی رسول کے منصب کا قرآن و سنت سے کوئی ثبوت نہیں ہم پہنچا، اور نہ اس معنی میں خلفائے راشدین خلفاء تھے، اور نہ انکی اطاعت اس حیثیت سے واجب تھی، آنحضرت صلعم کا منصب محض روحانی اور دینی تھا، وہ صرف رسول اور نبی تھے، کوئی حکمران یا فرمانروا نہ تھے، نہ آپ نے کوئی نظام سلطنت قائم کیا اور نہ اسلام کسی اصول سلطنت کا واضح خلفائے راشدین کوئی دینی منصب نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ محض دنیاوی حکمران اور فرمانروا تھے، گو انھوں نے اپنے فرائض کو پوری خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس بنا پر خلافت کا تحویل مذہبی اور دینی حیثیت سے تمام تر لوگوں سے اور مسلمان اصول سلطنت اور نظام حکومت کے وضع کرنے میں پوری طرح آزاد ہیں قاضی صاحب چونکہ پڑھے لکھے آدمی ہیں، اسلئے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں قرآن کی آیتوں اور احادیث و سیر کے واقعات کی پوری جانچ کی ہے، اور اپنے خدان ہر قسم کی شہادت کو توڑنے کی خاصی کوشش کی ہے، مگر کامیابی معلوم ان کوششوں کا منظر یہ ہو کہ وہ غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اسلام کا کوئی اپنا نظام حکومت نہایت ہو جائیگا تو موجودہ طرز حکومت جسکو یورپ نے صد ہا تجربوں کے بعد قائم کیا ہے اور جو ان کے نزدیک ہر قسم کی انسانی ساداتوں اور الٰہی برکتوں کا مرکز ہے، اس سے مسلمان ہمیشہ محروم رہ جائینگے،

جو مسلمان تو ہیں ابھی تک پرانے طرز پر شخصی خلافت کی معترف اور خواہاں ہیں انکا بھی کسی ایک شخصیت پر اتفاق نہیں، کچھ پرانے ترک اور سائپرین (قبرص) کے مسلمان وحید الدین کے طرفدار ہیں، تو جوان ترکوں میں جو خلافت کے حامی ہیں اور شاید ہندوستان کے بھی بعض رہنما اور عام مسلمان علیٰ الحدیث

کی امامت کے حامی ہیں، علمائے ازمہر نے باقاعدہ عبدالحمید کی معزولی کی تصدیق کی اور سلطان نواز شاہ مصر کی امامت کے لیے کوشاں ہیں، عرب میں دو قوتیں ہیں، امام مکی کی مین مین اور سلطان عبدالعزیز کی نجد میں، یہ دونوں اپنی اپنی مستقل امامت کے مدعی ہیں، امام مکی تو زیدی ہیں شاید انکو اہلسنت تسلیم نہ کریں، لیکن اگر سلطان عبدالعزیز حجاز میں کامیاب ہو جائیں اور اپنی شدت و عصبیت میں کچھ نرمی اور رواداری پیدا کریں تو شاید اصلاح طلب مسلمانوں کا بڑا حصہ انکی امامت کو تسلیم کر لے،

بہر حال گزشتہ تفصیلات سے یہ ظاہر ہو گا کہ اس وقت امامت اسلامیہ یا مسلمانان عالم کی تنظیم کا مسئلہ تمام ارباب فکر مسلمانوں کے سامنے سب سے زیادہ اہم اور قابل غور بن گیا ہے، یہ تمام خیالات تین مختلف صورتوں کے اندر محدود ہیں

۱۔ امامت عامہ اور عالمگیر اسلامی خلافت کی ضرورت ہے اور نہ ممکن ہے،

۲۔ امامت عامہ اور عالمگیر اسلامی خلافت کو سیاست و حکومت سے الگ کر کے صرف روحانی و مذہبی پیشوائی کی حیثیت سے قائم کرنا چاہیے، امامت و خلافت کی مسلمان قوموں کی تنظیم کے لیے ضرورت ہے، اور اس طرح اس کا قیام ممکن ہے،

۳۔ عرب میں یا ترکی میں ایک با اقتدار شخصی امامت و خلافت مجلس دارکان شوری کی قید اور دینی و دنیاوی دونوں طاقتوں کیساتھ قائم کرنا چاہیے، اسکی حکومت کے دائرہ سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں میں اسکا اقتدار صرف مذہبی و دینی ہو گا، (باقی)

## سیر الصحابیات

جس میں نہایت مستند حوالوں سے ازدواج مطہرات نبات طاہرات اور عام صحابیات کے سوانح اور ان کے اخلاقی و مذہبی علمی کارنامے درج ہیں، لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ ضخامت ۲۲۵ قیمت ۲۰۰



## مشہور عرب ہر کیمیا جابر بن حیان

(ماہود از سائنس پر دگر پس جنوری ۱۹۲۵ء)

نوشتہ ای، سب، ہولم یارڈ، ایم اے، ایف آئی سی،

انسراٹلی شہر سائنس کلفٹن کالج، برسٹل،

ترجمہ جناب سردار محمد صاحب، ایم ایس سی، پی اے ایس، زراعتی کالج لالپور،

گزشتہ دو تین سال میں انگلستان اور جرمنی میں گبر (Geber) کے متعلق بہت سی

تحقیقات ہوئی ہے اور اب ہم اس قابل میں کہ اس مسئلے کے متعلق جو علم کیمیا کی ابتدائی تاریخ میں

ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کسی خاص نتیجہ پر پہنچ سکیں مختصر مسئلہ یہ ہے کہ علم کیمیا کے متعلق لاطینی

زبان میں چند کتابیں ہیں جو صد ہا سال سے گبر (Geber) سے منسوب کی جاتی رہی ہیں ان

میں علم کیمیا کے متعلق بہت سی معلومات موجود ہیں اور وہ ایسی زبان میں لکھی ہوئی ہیں جو بہت

بڑے زمانہ اور نوعیت معنون کے غیر معمولی طور پر صاف اور واضح ہے، لیکن یہ امر کہ وہ کتابیں کب

اور کہاں تصنیف ہوئیں اور ان کا مصنف کون تھا، ابھی تک راز سر بستہ ہی رہا ہے، اور کوئی

شخص مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب کسی بخش طور پر نہیں دے سکا:-

1-Summa 2 Perfectionis 3 De-Investigations

Perfectionis 4 De-Inventionem veritatis

5-Testa mention Geberis.

۱- کیا ان کتابوں کا مصنف درحقیقت گبر (Geber) ہی تھا،

۲- اگر سوال نمبر ۱ کا جواب اثبات میں ہو، تو گبر (Geber) کون تھا، اور اگر جواب

نفی میں ہو، تو پھر ان کا مصنف کون تھا؟

۳- کیا یہ کتابیں یورپ میں تصنیف ہوئیں اگر وہاں تصنیف ہوئیں تو کب، اور اگر وہ یورپ

میں تصنیف نہیں ہوئیں، تو کیا وہ علم کیمیا کے متعلق عربی تصانیف سے اخذ کی گئی ہیں؟

اس وقت تک مندرجہ بالا امور پر جو شہادت مل سکتی تھی، اس پر مجموعی طور پر غور نہیں کیا گیا، گو سب

بحث کو ایک مضمون کی حدود میں لانا مشکل ہے، لیکن اس کے ضروری حصوں کا خلاصہ پیش کیا جائیگا،

اس طرح سے یہ ظاہر کرنا ممکن ہو جائیگا کہ جو مختلف نتائج اخذ کئے جا چکے ہیں، ان پر کہاں تک اعتماد

کیا جاسکتا ہے،

گبر (Geber) کی شخصیت | بیشتر اس کے کہ سما (Summa) وغیرہ کی اصل کے متعلق بحث

کی جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گبر (Geber) کی شخصیت کے متعلق فیصلہ کیا جائے، سما

(Summa) کی کئی ایک طبع شدہ (ایڈیشنوں میں گبر (Geber) کو عرب کہا گیا

ہے، گو یہ بات کسی قلمی نسخے میں نہیں ملتی، چنانچہ رسل (Rasoul) کے انگریزی ترجمہ میں ہے

ایک مشہور عربی شہزادہ اور منطقی کہا گیا ہے، ۱۱۸۲ء کی نون برگ (Nuremberg) کی ایڈیشن میں

وہ صرف عرب ہے، ۱۸۸۲ء کی ڈان زگ (Danzig) کی ایڈیشن میں اسے عربوں کے

بادشاہ کے نام سے نامزد کیا گیا ہے، اور ایڈیشنوں میں بھی اسے عرب ہی کہا گیا ہے، لیکن بوڈلین

(Bodlian) کتب خانہ کے ایک قلمی نسخے (Liber practicus) میں

Investigations perfecta magisterii میں جو غالباً پندرہویں صدی کی تصنیف ہے،

اسے ایرانیوں کے بادشاہ کا خطاب دیا گیا ہے، ۱۸۴۳ء کی طبع شدہ ایک کتاب (Liber



گیر (Geyer) شاہ ہند کی تصنیف خیال کیجاتی ہے، مندرجہ بالا مختلف آراء سے یہ صاف ظاہر ہے، کہ گیر (Geyer) کو کسی دوسری طرح کا ایشیائی خیال کیا جاتا تھا، اور کثرت رائے اس کے عربی النسل ہونے کے حق میں تھی۔

علم کیمیا کے متعلق زمانہ وسطی کی اکثر ایسی تصانیف ملتی ہیں، جن میں گیر کا ذکر آتا ہے، اور عام طور پر گیر ابن حقیق (Geyer ibn Haqiq) اور بعض دفعہ گیر کے بجائے جیسر (Jeser) بھی دیکھا گیا ہے، اور گیر (Geyer) یا جیسر (Jeser) دراصل جابر (Jabir) سے چنانچہ جابر ابن حقیق کی تصانیف میں گیر کا ذکر آتا ہے، وہاں مراد عربی ماہر کیمیا جابر بن حیان (Jabir ibn Hayyan) سے ہی ہے، جے (J) کے بجائے جی (G) کا آجانا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے، لاطینی میں جے (J) کے مترادف کوئی آواز نہیں، اور بعض علاقوں مثلاً مصر وغیرہ میں جے (J) کو اب بھی بطور سخت جی (G) یعنی گ استعمال کیا جاتا ہے،

دوسرا امر دریافت طلب یہ ہے، کہ آیا اس نام یعنی جابر بن حیان (Jabir ibn Hayyan) کا کوئی عربی ماہر کیمیا ہوا بھی ہے، خوش قسمتی سے اس میں کوئی وقت پیش نہیں آتی، انھوں صدی کے آخری حصہ میں خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں ابوسوسی جابر بن حیان ایک مشہور عالم کیمیا اور طبیب گذرا ہے، اس کی زندگی کے متعلق کچھ حالات پروفیسر راسکا (Raschke) اور موجودہ مضمون نویس کے مضامین سے مل سکتے ہیں، تیرہویں صدی کا مسلمان مورخ ابن القفطی (Ibn al-Qifti) نے اس کا نام

اپنی کتاب تاریخ الکیمیا میں لکھا ہے، کہ جابر علوم طبیعی اور خاص طور پر علم کیمیا کا بڑا جید عالم تھا، کئی ایک کتبوں کا مصنف مشہور فلسفی، عالم خفیہ کا ماہر اور اچھے اعلیٰ پایہ کا صوفی تھا، بعض مصنف اس کے علاوہ اور تفصیل بھی دیتے ہیں، جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا، بعد کے تمام مسلمان علماء کیمیا جابر کا بڑی عزت سے ذکر کرتے ہیں، اور ان میں سے اکثر اس کی تصانیف کے حوالے بھی دیتے ہیں

القصد اس کی شہرت مسلمان علماء کیمیا میں سب سے زیادہ تھی،

لاطینی تصانیف جو جابر کی طرف منسوب کیجاتی ہیں، اگر لاطینی تصانیف جنکا ذکر اوپر آچکا ہے، غلطی سے جابر کی

انت منسوب کیجاتی ہیں، تو اسکی شخصیت یعنی گیر (Geyer) کا جابر بن حیان (Jabir ibn Hayyan)

نام ثابت ہو جانا کوئی خاص معنی نہیں رکھتا، لیکن اس کی شخصیت کے متعلق فیصلہ مندرجہ

بالا کتب کی اصل کی تحقیقات میں کسی حد تک مدد دیتا ہے، ان کے عربی الاصل ہونے کے متعلق

ان کے اندر جو نشانات پائے جاتے ہیں، انھیں بغور مطالعہ کرنے کی طرف راغب کرتا ہے، جابر

بن حیان کی ان تصنیفات کے مطالعہ کو جو اس وقت دستیاب ہو سکتی ہیں، ضروری قرار دیتا ہے،

اور ان لاطینی تصانیف متعلق علم کیمیا کے مطالعہ کو جو سما (Sama) وغیرہ میں شامل نہیں،

لیکن جابر کے ساتھ ان کا تعلق خیال کیا جاتا ہے، اس مسئلہ کے حل کا ایک حصہ قرار دیتا ہے، اور

یہ امر دریافت کرنا بھی کہ عربی علم کیمیا یورپ میں کس طرح گیا، ضروری ہو جاتا ہے،

اس مشکل مسئلہ کے حل کرنے میں برٹولے (Berthollet) نے انیسویں صدی کے

آخری عشرہ میں بڑی مستعدی سے کوشش کی، اور بہت سے مواد کو ایسی صورت دی، کہ عوام کیلئے

اس کا مطالعہ آسان ہو گیا، لیکن اس نے نتائج اخذ کرنے میں بہت جلدی کی، کئی مصنفوں نے

اس کے کام پر تنقید کی ہے، اور اب یہ تسلیم کیا جاتا ہے، کہ برٹولے کے اخذ کردہ نتائج ترمیم کے

محتاج ہیں، چند عربی نسخے جنکو جابر بن حیان سے منسوب کیا جاتا ہے

ELANDIT اور لیڈن (Leiden) میں موجود ہیں، برٹولے نے ان میں سے ایک درجن

کتبوں کی اصل متن کو پروفیسر اوڈاس (Oudart) کے ترجمہ کے ساتھ

شائع کیا، ان کتبوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے، کہ ابتدائی وہ لاطینی

میں تصنیف نہیں ہوئیں، برٹولے نے اس سے یہ نتیجہ نکالا، کہ ابتداء میں وہ لاطینی کے بجائے



کسی اور یورپی زبان میں لکھی گئی ہوگی اور جابر کے ساتھ ان کے تعلق کو غلط خیال کیا، برٹوں کے نتائج پر دوا اعتراض ہو سکتے ہیں:-

۱۱) کیا یہ یقینی امر ہے کہ عربی تصانیف جو اس وقت معرض بحث میں ہیں اصل ہیں۔

۱۲) متنازعہ لاطینی کتب جابر کی اور تصانیف کا ترجمہ کیوں نہیں ہو سکتیں،

ان دونوں اعتراضوں میں سے پہلے کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر رسکا (Reska)

نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ برٹوں کے شائع کردہ عربی نسخوں میں سے دو بالکل جعلی ہیں، اور دوسرے میں مصنف صاف طور پر اپنے آپ کو دوسرے ابو عبد اللہ محمد بن یحییٰ کہتا ہے، اس لئے باقی

نسخوں کو ہم مشتبہ خیال کرنے میں حق بجانب ہیں، اور ان کو شہادت میں پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کا بڑی احتیاط سے امتحان کر لیا جائے، جابر کی بہت سی تصانیف اب تک ملتی ہیں جن کے متعلق شبہ کی گنجائش نہیں، ان میں سے بعض میں سے ہم قلمی سلومات حاصل کر سکتے ہیں دوسرے اعتراض کے متعلق یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ویڈمین (Weedman)

رسکا (Reska) اور سٹین شنائیڈ (Stein Schneider) علم تاریخ اسناد کی بنا پر متفق

ہیں کہ لاطینی کتب اپنی موجودہ شکل میں عربی نسخوں سے ترجمہ شدہ خیال نہیں کیجا سکتیں، اس رائے سے بچھے بھی اتفاق ہے، لیکن اتفاق کرتے ہوئے بھی تھوڑا سا اختلاف رائے رکھتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ لاطینی کتب میں بعض صاف طور پر عربی سے ترجمہ شدہ معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں عربی جملے اور عربی نحوی ساخت اکثر پائی جاتی ہے، یہ صاف ظاہر ہے کہ مسئلہ کے حل کا صرف

یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم جابر کی ان تصانیف کا جو معتبر خیال کیجاتی ہیں، انہیں مطالعہ کریں، اور لاطینی کتب سے ان کی مشابہت ثابت کرنے کی کوشش کریں، اس طریقہ پر عمل کر کے چند امید افزا

نتائج حاصل ہوئے ہیں، جنکا بعد میں ذکر کیا جائے گا، ابتداء میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے،

کہ عربی نسخوں کے لاطینی میں ترجمہ ہونے کے متعلق چند امور پر غور کیا جاسے اس کام میں محنت بہت درکار ہے، لیکن باوجود اس کے بارہویں اور تیرھویں صدی کے بہت سے علماء سائنس اس کام میں مصروف رہے،

علم کیمیا پر عربی تصانیف کے لاطینی میں ابتدائی تراجم سب سے پہلے اندلس میں مسلمان اور یورپی علماء کا آپس میں میل جول ہوا اور پھر کے مختلف حصوں سے فوج ان طالبان علم نے مسلمان علماء کے پاس جمع ہو کر زانوئے شاگردی کر لیا، اور ایک قلیل عرصہ میں ان کا نئے علم کا شوق بہت ترقی کر گیا، عربی تصانیف کا لاطینی میں ترجمہ اتنا ضروری ہو گیا کہ طلبہ کا ایک خاصہ گروہ اس میں لگا کر مصروف رہتا تھا، مترجموں میں سے چند مثلاً ایڈلارڈ آف باٹھ (Adelard of Bath) ہرین

آن ڈال میٹیکا (Hermann of Dalmatica) اور گیرڈ آف سیرمونیا (Gerard of Cremona) ابھی خاصی شہرت رکھتے ہیں، چونکہ علوم طبیعی، جن میں کیمیا بھی شامل

ہے، مسلمانوں میں خاص طور پر عام تھے، اس لئے تراجم میں کتب طبیعیات اور ریاضی کی زیادتی باعث تعجب نہیں، روبرٹ آف چسٹر (Robert of Chester) نے بارہویں

صدی میں انوار زمی کا ابجرا انگریزی میں ترجمہ کیا، چنانچہ اس کا ذکر میچلن یونیورسٹی (Michelin)

جان کے پروفیسر کارنفسکی (Karpenski) کے مضامین میں پایا جاتا ہے، روبرٹ

آن چسٹر نے اور کتبوں کا بھی ترجمہ کیا ہے، جن میں سے قرآن کا ترجمہ خاص طور پر قابل ذکر

ہے (De compositione Alchemiae) مصنفہ مورنیز رودنس (Morien)

us Romanus) کا بھی اس نے ترجمہ کیا، رسکا کا خیال ہے کہ روبرٹ نے یہ کام

۱۱۸۲ء کو ختم کیا، اور لاطینی میں علم کیمیا پر یہ پہلی کتاب تھی، اگرچہ کوئی عربی نسخہ ایسا

نہیں ملتا، جو تمامہ اسکی اصل کلاس کے، لیکن مختلف عربی کتب میں بعض چھوٹے اور بعض بڑے



پائے جاتے ہیں جو فیضاً اس کتاب کے ماخذ ہیں اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ (De Compositione Alchemica) اگر کسی عربی کتاب کا نقلی ترجمہ نہیں تو اس کے مضمون کو مد نظر رکھ کر ضرور لکھی گئی جو اس کا خیال ہو کہ ترجمہ بدست آن چسٹرنے نہیں کیا کیونکہ مترجم اپنے آپ کو فوجوان ظاہر کرتا ہوا اور لاطینی سے کسی قدر ناواقفیت کا اظہار کرتا ہے، لیکن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ۱۲۳۷ء میں ردبرٹ نے قرآن کا لاطینی ترجمہ ختم کر دیا تھا جو کہ مشہور بین (Basile) مع منکتمین (Proclamation) کے دیباچہ کے شائع ہوا اس کا ترجمہ کی صداقت میں کچھ کلام ہے، اس کا خیال ہے کہ یہ کتاب دراصل ترجمہ نہیں بلکہ عربی کتب کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مندرجہ بالا حصص کے عربی اصل سے واقفیت نہیں، چنانچہ وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ مجموعی طور پر (Compositione Alchemica) غلط بیانی پر مبنی ہے اور غلط بیانیوں کے ایک سلسلہ میں سے ایک کڑی ہے جنکی ابتدا ساتویں یا آٹھویں صدی میں ہوئی۔

اس میں شبہ نہیں کہ عربی کتب کیا کے ترجمے ہوئے، اور بعض صورتوں میں اصل کتاب اور اس کا ترجمہ دونوں ہمارے سامنے موجود ہیں، چنانچہ رازی (ابو بکر محمد بن زکریا الرازی) کی کتاب الاسرار اور رسالہ الشمس علی الاملاک مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں، یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ چونکہ عربی اور لاطینی میں بہت زیادہ فرق ہے، اس لئے اصل کا صرف مطلب ادا کر دینا ترجمہ کرنے کی نسبت بہت آسان تھا، اور عام طور پر یہی آسان طریقہ استعمال کیا گیا کسی ترجمہ کے متعلق رائے زنی کرتے وقت ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیے، اور ان کتب کو جو نقلی ترجمے ہیں، لاطینی الاصل کہہ کر دیتی نہیں کر دینا چاہیے، یہ سخت غلطی ہوگی، کہ صرف سلیس زبان کی بنا پر کسی کتاب کو عربی الاصل قرار دیا جائے، عام طور پر مندرجہ بالا اصول کو مد نظر نہیں رکھا گیا، اور بہت سی کتابوں

کو بجائے ترجمہ کہنے کے جعلی قرار دیا گیا ہے، اس قسم کے فیصلہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اور طرز بیان کی نسبت نفس مضمون بہتر راہبر ہو سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ راہبر اس وقت تک مدد نہیں دے سکتا جب تک عربی کتب کا وسیع پیمانے پر مطالعہ نہ کیا جائے، بہت ضروری ہے کہ شائقان تحقیقات اس میدان میں نکلین، بہت سامواد تحقیقات کے نتائج کا منتظر ہے،

اصلی گیر اب ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ (۱) گیر (Geyer) سے مراد دراصل جابر (Jabir) ہی ہے (۲) ایک مسلمان عالم کیمیائے ایسا گندما ہے جس کا نام جابر بن حیان تھا، (۳) عربی کتب کیمیا کے ترجمے لاطینی میں بارہویں اور تیرہویں صدی میں ہوئے، (۴) اکثر دفعہ ایسا ہوا ہوگا کہ عربی علمائے نقلی ترجمہ کرنیکی بجائے صرف عربی نسخہ کے مضمون کو ہی ادا کیا، اور آخر میں (۵) یہ ضروری ہے کہ کسی کتاب کے اصل کے متعلق فیصلہ کرتے وقت نفس مضمون کا سب سے پہلے کا نظر رکھا جائے اور طرز تحریر کا بعد میں۔

اب ہم گیر (Geyer) یا جابر (Jabir) کی زندگی اور اسکی تصانیف کے متعلق کچھ اور واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس میں دو وقتوں کا سامنا ہے پہلے تو اس مضمون میں ہمارے پاس گنجائش ہی نہیں، دوسرے ان کتابوں میں سے جو جابر کی تصانیف خیال کی جاتی ہیں، بہت تھوڑی ایسی ہیں جنہیں علمائے یورپ نے پڑھا ہو، باوجود ان وقتوں کے ہم جابر کی قابلیت کے متعلق کچھ نہ کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں، اور سما (See also) اور دوسری لاطینی کتب کی اصل کے متعلق جو جابر سے منسوب کی جاتی ہیں، کچھ رائے قائم کر سکتے ہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ ابتدا میں یہ امر واضح کر دیا جائے کہ اس راستہ میں غیر معمولی دشواریوں کا سامنا ہوگا، کیونکہ بہت سی عربی تصانیف ہیں جنکی صداقت بذات خود مشتبہ ہے، لیکن اس پر آئندہ بحث کی جائیگی،

جابر کے متعلق حقیقت ہمارے معلومات اتنے زیادہ ہیں کہ پرانے زمانہ کے حکما میں سے



کسی اور کے متعلق اتنے نہیں گواہ کی جائے ولادت کے متعلق قابل اعتبار شہادت نہیں ملتی، لیکن اگر مصنف اس بات پر متفق ہیں کہ یا قودہ طوس واقع خراسان، یا حران واقع عراق عرب کا رہنے والا تھا، ان دونوں مقاموں سے میں پہلا زیادہ اغلب معلوم ہوتا ہے، اور اگر ہم جابر کو مشہور فارسی شاعر زوسی کا موطن خیال کریں تو غالباً بڑی غلطی نہیں ہوگی، سب مصنفوں کا اتفاق ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ کوزہ میں صرف کیا، اور اس کا محل (دار التجارب) کوئی دو سو سال کا عرصہ ہوا، کچھ پرانے مکانوں کو گراستے وقت ملا تھا، ہارون الرشید کے مشہور خاندان و زرارہ البرکہ اس کے دوست تھے، چنانچہ اس نے اپنی کئی تصانیف انہی سے نامزد کیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ کچھ دن وہ دارا سلطنت بغداد میں بھی رہا، یہ قصہ کہ وہ سیول (۵۷۷ھ) کا رہنے والا تھا، بالکل یہودہ ہے، ہان و ہان ایک اور عالم اس کا ہنام جابر بن فلّاح اسیلی گیارہویں صدی کا مشہور منجم ہوا ہے،

کہا جاتا ہے، کہ جابر چھٹے امام (۳۲۰ھ سے ۳۶۰ھ) جعفر صادق کا شاگرد تھا، اور یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جابر نے غالباً ۳۲۰ھ سے ۳۸۰ھ تک کا زمانہ پایا جاتا ہے، لیکن اگر غیر غلب ہے، کہ آیا امام جعفر نے خود علم کیمیا کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں، اس مضمون پر پروفیسر رسکا (Ruska) نے حال ہی میں ایک رسالہ شائع کیا ہے، جس سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے، مسلمانوں میں شیعہ اور سنی دو مشہور فرقے ہیں، شیعہ عام طور پر زیادہ تعداد میں ایران میں پائے جاتے ہیں، اور پیغمبر اسلام کے چچرے بھائی علی بن ابی طالب کی باقی میں خلفاء کی نسبت زیادہ عزت کرتے ہیں، اور شیعوں کی نسبت تصوف کی طرف زیادہ مائل ہیں، امام جعفر صادق جہنیت اور لاداعی شیعوں میں خاص عزت رکھتے تھے، اور جابر چونکہ فارسی تھا، اور صوفی بھی، اس لئے دونوں کا تعلق غیر غلب نہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علم کیمیا کے متعلق جن سے کیا صحیح ہے؟ معارف

کتب کا تعلق جعفر صادق کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، وہ سب جعلی ہیں، اور رسکا اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ بالکل غیر غلب ہے، کہ جعفر نے کیمیا کا مطالعہ کیا ہو، رسکا جو دلائل پیش کرتا ہے، وہ زیادہ قوی اور پیچیدہ ہیں، اور ان کا یہاں دہرا نا غیر ضروری ہے، لیکن اسکی ایک زبردست دلیل یہ ہے، کہ گودمشق بغداد اور اسکندریہ میں کیمیا کی تعلیم عام تھی، لیکن یہ امید نہیں کیجا سکتی، کہ پیغمبر اسلام کے اپنے شہر مدینہ میں اس کی سرپرستی ہو رہی ہو، اور یہ بالکل غیر غلب ہے، کہ جعفر صادق کی حیثیت کا اہم پارے، گندھک، کٹھانی اور بھکنی کے استعمال میں مصروف ہو کر جابر کو کیمیا کی تعلیم دے رہا ہو، چنانچہ رسکا اس بات سے بالکل انکاری ہے، کہ جعفر صادق کا کیمیا گری سے کوئی بھی تعلق تھا، اور وہ اس پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ یہ بھی کہتا ہے، کہ وہ تمام کتب جنکو جابر سے منسوب کیا جاتا ہے، اور ان میں جعفر صادق کو جابر کا استاد بیان کیا گیا ہے، زماٹ بعد کی جعلی تصانیف ہیں،

میرا اپنا خیال ہے کہ مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر مندرجہ بالا نتائج پر پہنچنے میں ہم حق بجانب نہیں ہیں، (۱) جہاں تک میرا علم ہے، یہ بات ثابت نہیں ہوتی، کہ جعفر صادق نے اپنا تمام زمانہ مدینہ ہی میں گزارا ہو، گو مجھے رسکا سے یہاں تک اتفاق ہے، کہ اس زمانہ میں شہر مدینہ میں کیمیا کا کھلم کھلا شغل اور تعلیم قرن قیاس نہیں، لیکن یہ امر تسلیم کرنے میں کوئی خاص اعتراض معلوم نہیں ہوتا، کہ جعفر صادق نے کسی اور مقام پر یہ شغل اختیار کیا ہو،

(۲) رسکا کو خوب علم ہے، کہ ایرانی اس وقت اور اس کے بعد بھی کیمیا کے بڑے شائق رہے ہیں، عام علم ادب میں کیمیا گر ہمیشہ ایرانی ہی خیال کیا جاتا ہے، اور صوفی بھی اپنی نظموں میں کیمیائی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں، القصد یہ خیال کر کے کہ جعفر صادق کا ایرانی شیعوں کے ساتھ بڑا گہرا تعلق تھا، یہ مان لینا کہ وہ کیمیا گری سے اصولاً واقف تھے، گو علی طور پر وہ کیمیا گر نہ ہوں، چندان مشکل نہیں، (۳) جابر اور جعفر کا تعلق جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، بہت اغلب



معلوم ہوتا ہے اور رسکا اس سے صرف اس وجہ سے انکار کرتا ہے کہ اس کے خیال میں جعفر صادق کیسا گر نہیں ہو سکتے تھے، لیکن میں اس امر کو ثابت شدہ تسلیم نہیں کرتا، سب مصنف جابر کو صوفی مانتے ہیں اور اس گروہ میں عام دستور ہے کہ طالب کسی نہ کسی مرشد سے تعلق پیدا کرتا ہے، میرے خیال میں ممکن ہے کہ جابر جعفر کا صوفیانہ طریقہ میں شاگرد ہوا نہ کہ کیساگری میں اگر یہ درست تسلیم کر لیا جائے، تو ممکن ہے کہ جابر نے تھوڑی بہت کیساگری بھی سیکھ لی ہو، میں ثابت یہ کرنا چاہتا ہوں کہ جعفر صادق کیساگر نہ بھی ہوں، تو بھی یہ امر جابر اور جعفر کے مابین تعلق کے منافی نہیں اور اس سے یہ بھی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جعفر کیساگر دن کی اصطلاحات اور مقاصد سے بے خبر تھے یہ نکتہ مجھے زیادہ طوالت سے بیان کرنا پڑا ہے، کیونکہ اگر رسکا کی کسوٹی کو درست مان لیا جائے یعنی ان تمام کتابوں کو جن میں جعفر کو جابر کا استاد بیان کیا گیا ہے جعلی تصور کیا جائے، تو بہت سی کتابوں کو جو اصلی معلوم ہوتی ہیں جعلی خیال کرنا پڑے گا، اس میں شبہ نہیں کہ ابتدائی کیساگری تھانیف کو ہمیشہ مشتبہ لگا ہوں سے دیکھنا پڑتا ہے، لیکن کتابوں کی ایک بڑی تعداد کو سرسری تحقیقات کے بعد جعلی قرار دینا بالکل نامناسب ہے، پروفیسر رسکا کی نہایت محتاط اور عالمانہ تحقیقات نے اسلامی علم کیساکی تاریخ کی گران بہا خدمات کی ہیں اور اس کے نتائج سے مجھے کئی اتفاق ہے، لیکن مضمون زیر بحث میں مجھے اس کی کسوٹی کے ساتھ اتفاق نہیں، ممکن ہو کہ وہ صحت پر ہو، اسکی رائے قابل قدر ہے، لیکن شہادت کافی نہیں، اور جو تھوڑی بہت ہے اس کے برخلاف بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے،

جابر کی زندگی کے متعلق جو حالات مجھے مسلمان مورخوں کی تصنیفات سے ملے، وہ

میں نے روبرو اڈا ایل سوسائٹی آف میڈیسن (Royal Society of Medicine) میں نمبر ۱۹۲۳ء میں شائع کئے تھے، اس کے بعد مجھے ایک اور مضمون اجماع کی کالکھا ہوا ملا، جلد کی تاریخ کے قریب نوٹ

اور اسلامی کیمیا کی دائرۃ المعارف کا مشہور مصنف تھا، رسالہ موسومہ کتاب البرہان فی اسرار علم المیزان میں وہ یوں لکھتا ہے، "استاد اعظم جابر بن حیان بن عبد اللہ کوفہ میں پیدا ہوا، وہ طوسی النسل تھا، اور آزاد نامی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، خیالات میں صوفی، اور میں کے رہنے والے، حرابی، اجمیری کا شاگرد تھا، حرابی عمر میں میں سے ایک تھا، جابر نے لفظ عمرین کی تشریح کی ہے اور کہتا ہے کہ حرابی نے چار سو سال کی عمر پائی، چنانچہ ہجرت سے دو سو سال پہلے پیدا ہوا، اور ہارون الرشید کے زمانہ یعنی ہجرت سے ۱۰۰ سال بعد تک زندہ رہا، اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے، جابر نے جب حرابی سے ادائل عمر میں علوم طبعیات کی تعلیم اچھی طرح حاصل کر لی، تو وہ امام جعفر صادق بن محمد الباقر بن علی بن حسین کے پاس گیا، اور ان کی صحبت میں وہ بھی امام بن گیا، اس کے بعد وہ البرکۃ کے ساتھ شامل ہوا، اور ان کی صحبت میں اس نے بہت ساعلمی کام کیا، اسی کے طفیل براکمر فہم و فراست سے بہرہ اندوز ہوئے، ان کا جاہ منصب بڑھا، سلطنت میں انھیں بہت زیادہ طاقت حاصل ہوئی، اور وہ بڑے سخی مشہور ہوئے، الغرض براکمر کا نام یہاں تک روشن ہوا کہ ان میں سے جعفر برملی کے نام کے دینار شاہی دیناروں کے نو نو پر ضرب ہوئے، وزیر جعفر کے توسل سے جابر کا خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں آنا جانا شروع ہو گیا، چنانچہ خلیفہ کے نام سے نامزد کر کے اس نے علم کیمیا پر ایک کتاب لکھی، جس کا نام کتاب شگوفہ رکھا (THE BOOK of bloom) اس کتاب میں اس نے علم کیمیا کے حلی و خفی پہلوؤں کے متعلق نہایت مختصر طریقے، نہایت ستھرا طریق عمل، اور عجیب و غریب تجربات بیان کئے، جابر کی وجہ سے ہی قسطنطنیہ سے دوسری دفعہ یونانی کتب بڑی تعداد میں لائی گئیں، منطق میں وہ علامہ دہر مشہور ہو گیا، اور نوے سال سے کچھ زائد عمر میں اس نے تین ہزار کتابیں لکھیں، اللہ اسے مغفرت دے،



ابجد کی اسلامی علمائے کیمیا کے متعلق لائق واقفیت رکھتا تھا، اسکی معلومات کے ماخذون میں سے اکثر آج ناپید ہیں، جابر کے متعلق مندرجہ بالا بیان باوجود اس کے کہ اس کا اکثر حصہ فائدہ مند ہے، دلچسپی سے خالی نہیں، کیونکہ استاد اعظم کی زندگی، جیسے پیدائش وغیرہ کے متعلق جو مشکلات تھیں ان میں سے اکثر کا حل اس مضمون میں ملتا ہے، اگر وہ کوفہ میں پیدا ہوا، اور طوس کے کسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، تو کوفی اور طوسی دونوں نسبتیں درست ہیں، خراسان سے کوفہ ہجرہ اور نئی اسلامی سلطنت کے او شہرون کی طرف یرانیوں کا بہت زیادہ تعداد میں خروج ہوا، اور کسی کو اس امر سے انکار نہیں ایک اور بات جو خاص دلچسپی کا باعث ہے، یہ ہے کہ جابر ہی کی وجہ سے دوسری دفعہ یونانی کتب قسطنطنیہ سے منگوائی گئیں، یونانی کتب پہلی دفعہ غالباً خلفائے بنو امیہ میں سے خالد بن یزید نے منگوائیں اور یہی واقعہ ابجد کی کے ذہن میں معلوم ہوتا ہے، خلیفہ المامون کے عہد حکومت (۸۰۰ء) سے پہلے یونانی کتب کے ترجمہ کا کام اپنے معراج تک نہیں پہنچا تھا، چنانچہ اس خلیفہ نے شہنشاہ لیو (Leo) ارمینی کے پاس ایک دفعہ کتب یونانی کے ترجمہ کی غرض سے بھیجا، اور شہر نیدا میں بیت الحکمت کے نام سے ایک عالیشان عمارت تعمیر کی، جس میں مترجم، منجم اور دوسرے علمائے سائنس اپنا اپنا کام کرتے تھے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو جابر کو زیادہ دلچسپی علم کیمیا کے مطالعہ میں تھی، لیکن وہ اور علوم کا بھی بڑا علامہ تھا، غالباً اسے یونانی زبان سے بھی واقفیت تھی، اسکی تصنیفات کی اپنی طیار کر د فہرست کتاب الفہرست کے مصنف نے نقل کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم کیمیا کے علاوہ اس نے اور مختلف مضامین پر بھی بہت کچھ لکھا ہے، اور یہ امر تعجب انگیز بھی نہیں، جب ہم ان علمی خزائن پر نظر ڈالتے ہیں جو جنڈیسا پور، حران، اسکندریہ اور دوسرے علوم یونان کے مرکزوں سے مسلمانوں کے پاس پہنچ رہے تھے، ایک ادب بات یاد رکھنے کے قابل ہے، جابر معدنی بھی تھا

اور ماہر کیمیا بھی، یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ تصانیف متعلقہ تصوف میں کیمیائی اصطلاحات اور طریق بیان استعمال کرے، اس لیے ہمیں محتاط رہنا چاہیے، کہ ہم کہیں ان رسالوں کو جو کیمیائی زبان میں علم تصوف پر لکھے گئے ہیں، علم کیمیا ہی تصور نہ کریں، خوش قسمتی سے جابر کی بہت سی تصنیفات میں کیمیائی عمل اور ترکیب کا حال نہایت واضح اور صاف زبان میں ملتا ہے، مرکبات اور آلات کے نام ایسے زمین لکھے ہوئے ہیں، کہ ان سے جابر کی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، لاطینی کتب پر غور کرنے سے یہ مضمون اور بھی واضح ہو جانا چاہئے، کیونکہ ان کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا، کہ عربی اصل کی نسبت ان میں کوئی کمی یا بیشی تو نہیں،

عربی کے مقابلہ میں لاطینی کتب کا نفس مضمون | مندرجہ ذیل سطور میں ان انگریزی کتب کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جو رسل رکنہ صمد حمزہ نے لاطینی سے تیار کی ہیں، صرف چند ضروری باتوں پر بحث کی جائے گی :-

الف، کتاب الاستقام، اس نام کی ایک کتاب، کتاب الفہرست میں جابر کی تصانیف کی ذیل میں پائی جاتی ہے، لاطینی نسخے میں دھاتوں کا ذکر ہے، اور ان کو مکمل کرنے کے متعلق تعلیم دی گئی ہے، چنانچہ اس میں لکھا ہے، کہ تمام دھاتیں خالص یا غیر خالص چاندی اور گندھک سے مرکب ہیں، اور ان دونوں کا خالص یا غیر خالص ہونا محض اتفاقی بات ہے، جابر کی کتاب الاداة (Adaptation) کے قاهرے والے نسخے میں لکھا ہے، "سب دھاتیں چاندی اور گندھک کی باہم ملاوٹ سے پیدا ہوتی ہیں، اور مختلف دھاتوں کا باہمی فرق اس لئے ہے، کہ چاندی اور گندھک کبھی خالص اور کبھی غیر خالص ہوتے ہیں، یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ لاطینی کتب کی صداقت کے برخلاف برٹوے کی ایک دلیل یہ تھی، کہ ان میں دھاتوں کے چاندی اور گندھک سے مل کر بننے کا مسئلہ پایا جاتا ہے، اور اس کے خیال میں جابر عربی کی تصانیف میں اسکا



ذکر نہیں

کتاب الاستقامت من مندرجہ ذیل اشیا کا دعوتون کی تیاری کے سلسلہ میں ذکر ہے انک،  
پھکری (Altrament) شیشہ، سہاگہ، سرکہ، جابر کو ان سب اشیا کا علم تھا، اور یہ قرین  
قیاس ہے، لفظ (Yamononolum) جو لاطینی کتب میں پایا جاتا ہے، قابل غور ہے،  
کیونکہ اس کے معنی میں کی پھکری ہے علاوہ ازیں کئی موقعوں پر جابر سرکہ کی صفائی بذریعہ عمل کشید بتا کر  
اور فحش کا شیطان است "سلطان میں ایک عام طرب امثل ہے، لاطینی کتابوں میں جو جو طریقے  
دعوتون کی تیاری کے بتائے گئے ہیں، سب کے سب عربی نسخوں میں ملتے ہیں، ان اتنا فرق ضرور ہے  
کہ عربی نسخوں میں ایک ہی کتاب میں نہیں ملتے،

اب مجموعہ کمال (The sum of perfection) اس کتاب کا دیباچہ یقیناً عربی سے

ترجمہ ہے، یہ فقرہ "ہماری اور تصانیف میں جو کمی ہے وہ ہم نے اس کتاب میں پوری کر دی ہے"  
جابر کے اس بیان سے بالکل ملتا ہے "ہم نے اپنی معلومات کو کئی کتابوں میں رکھا ہے"

گیر (Geber) کہتا ہے: "ایسے ذرائع معلوم کرنے چاہئیں، جن سے قدرت

کا مقابلہ ہو سکے، جابر (Geber) کہتا ہے: "ماہران کیمیا مصنوعی طریقوں سے قدرت  
کی نقل تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں"

گیر (Geber) "مصور یا معمار بہت مخفی ہونا چاہئے، جس وقت تک کام ختم  
نہ ہو جائے، اسے بہت زیادہ ہارنی چاہئے"

جابر (Geber) "علم کیمیا کا مطالعہ کرنے والا ثابت قدم ہونا چاہئے، اور اسے  
فطری مشکلات سے ڈر کر تجربوں کو چھوڑنا نہیں چاہئے"

جو لوگ کیمیاگری کی اصیت سے منکر تھے، ان کے برخلاف لاطینی کتب کی دلائل میں

یاد دلاتی ہیں، کہ تیرہویں صدی میں رتبات الحکیم کے مصنف کے قول کے مطابق جابر کو بد اعتقادوں  
کے برخلاف بڑی جدوجہد کرنی پڑی تھی، عربی کتب میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے، لیکن ان  
میں سوال و جواب کا طریقہ ایسا سخت نہیں جیسا کہ لاطینی کتب میں، آلات کی ساخت اور استعمال  
کے متعلق جوہر یا گیر (Geber) دیتا ہے، وہی جابر کی تصنیف کتاب الخواص میں ملتی ہیں  
اس کا چودھواں باب کشتہ سازی کے بیان میں ہے، جابر نے اسی مضمون پر ایک کتاب لکھی ہے،  
اور خوش قسمتی سے اس کا ایک حصہ اب بھی ملتا ہے، دونوں کی عبارت ملاحظہ ہو:-

لاطینی نسخہ - کشتہ سازی سے مراد کسی چیز کا بذریعہ آگ سفوف بنانا ہے، اس عمل میں رطوبت  
جوشے مذکور کے ذرات کی پوشگی کا باعث ہوتی ہے، ضائع کیجاتی ہے اور ترکیب اشیا میں گندھک

کی وجہ سے جو غلاظت اور خرابی واقع ہو جاتی ہے اسے آگ کے ذریعہ تلف کیا جاتا ہے، اسکا  
طریقہ عمل مختلف اشیا کی صورت میں مختلف ہے، ٹھوس اشیا کا کشتہ بنایا جاتا ہے، مائع سیال

کا بھی، اور ان اشیا کا بھی جو ان ہر دو مضمون میں نہیں آتین، ہر حالت میں مقصد اور طریقہ مختلف ہے  
عربی نسخہ کتاب التحف کی عبارت حسب ذیل ہے: "کشتہ سازی سے مراد یہ ہے کہ دھاتوں

کو گرم کر کے ان میں سے غیر ضروری ملاوٹ نکالی جائے، اور ان کو صاف کیا جائے، طریقہ عمل  
ہر دھات کی صورت میں مختلف ہے، وجہ یہ ہے کہ بعض دھاتیں قدرۃ خالص واقع ہوئی ہیں

اور ان میں کشتہ سازی سے مراد صرف ہر ایک سفوف تیار کرنا ہے،

اس امر کو کہ چاندی گندھک کے جل جانے کے بعد اپنی اصلی حالت میں آجاتی ہے، جابر

کتاب الخواص کے ضمن میں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے: "اگر چاندی کو کوٹ کر اس پر  
گندھک چڑھائی جائے، اور بعد میں مناسب درجہ حرارت تک گرم کیا جائے، تو باہر نکالنے پر

پیشہ کی طرح ہر ایک پس سکتی ہے، اگر اس کے بعد اسے پھر آگ میں رکھیں اور سہاگہ کی موجودگی



مین گرم کرین تو یہ اپنی اصلی حالت میں آجاتی ہے ۱۱

شورے کے تیزاب کی تیاری کا بیان جو کتاب نمبر ۱۱ میں پایا جاتا ہے، مین نے ایک کتاب کے قلمی نسخہ میں جو کہ قاہرہ میں موجود ہے، حال ہی میں دیکھا ہے، یہ کتاب بھی جابر کی تصنیف خیال کی جاتی ہے،

ان چند مثالوں سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ لاطینی اور عربی کتب کے نفس مضمون میں بہت حد تک مشابہت ہے، مقامات مشابہت کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ آئندہ تحقیقات کے بعد ضرور اور اضافہ ہوگا،

نتیجہ یہ ہے کہ مسئلہ گہر کی موجودہ صورت بمقابلہ اس صورت کے جو چند سال پہلے تھی، بالکل مختلف ہے، اور مندرجہ ذیل نتائج کسی حد تک مسئلہ خیال کیے جا سکتے ہیں:-

۱۱ گیسبر در حقیقت جابر بن حیان ہی ہے،

۱۲ جابر کی یہ شہرت کہ وہ مسلمانوں میں سب سے مشہور ماہر کیا ہوا ہے، اس کی تصانیف

سے ثابت ہے،

۱۳ لاطینی تصانیف جو جابر سے منسوب کی جاتی ہیں، عربی سے نقلی ترجمے نہیں بلکہ عربی کتب کے نفس مضمون کو مد نظر رکھ کر لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں،

۱۴ لاطینی کتب اور جابر کی عربی تصانیف کے مضمون میں غیر معمولی مشابہت پائی جاتی ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا یہ مشابہت لاطینی کتب کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگی یا نہیں، اس امر کا فیصلہ وقت اور تجربہ کرے گا،

## دوا بہ دریا چون و چون کی تاریخ پر ایک نظر

۲- نمبر یک بحث مسئلہ،

از

پروفیسر جلیل الرحمن ایم اے جامعہ شمسائیہ

جو کچھ ادب پر بیان ہوا وہ محض قیاسات پر مبنی نہیں چونکہ ۱۲-۱۳ء کے نقل مکان کے آخری دور

میں اسی قسم کا مادہ پیش آیا اور مسلمان طبیعت و نابود ہونے سے بالکل بال بال بچ سکے، قاعدہ ہے کہ کسی قومی نقل مکان کے موقع پر سب سے زیادہ ہل چل اس وقت ہوتی ہے جب کہ یہ جنگ کے قریب آتھو ہوتے ہیں، اور ساتھ ساتھ چون چون یہ بے چینی انتہائی حد کو پہنچتی جاتی ہے، تو بے شمار انسان اس میں شامل ہونے کیلئے اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوتے ہیں، اس وقت بھی یہی ہوا، بے چینی کا اصل مرکز یوریشیا کے جنگل تھے، اور اس علاقے کے وہ

لوگ جو سب سے پہلے اسلامی ممالک پر حملہ آور ہوئے وہ تھے جو ان جنگلوں کے بالکل کناروں پر رہتے تھے ان میں بطوری بھی شامل تھے، کیونکہ نقل مکان سے ایک مدت پہلے وہ ماوراء النہر کی تہذیب سے متاثر ہو چکے تھے، اور

چونکہ ۱۲ء کے فیصلہ کے مطابق یہ تہذیب خالص وسط ایشیا کی تہذیب ہونے کے بجائے، اسلام کی فاتحانہ تہذیب تھی، اس لئے قبل اس کے کہ وہ ابرو بار کے طوفان کی طرح اپنے اصلی وطن کو چھوڑ کر اسلامی ملک

پر حملہ آور ہوں بطوریون نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسی وجہ سے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان کا یہ حملہ اسلامی تہذیب و معاشرت کے لئے بالکل خطرناک ثابت نہ ہوا، بلکہ اس سے مسلمانوں کو تقویت حاصل ہو گئی لیکن

نقل مکان کے سلسلہ کے آخری اور سب سے زیادہ تباہ کن دور میں مسلمان بالکل امن میں نہ رہ سکے اور ان کو سخت نقصان اٹھانا پڑا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مرتبہ یہ خانہ بدوش حملہ آور وسط ایشیا کے ایسے گہرے جنگلوں



سے نکل کر آئے تھے جن پر ایک اسلام کا مذہبی اور تمدنی اثر نہیں پڑا تھا، حالانکہ اس وقت ماوراء النہر کی اسلامی فتح کو پانچ سو برس کا عرصہ گزر چکا تھا، لیکن اس کا مطلب نہ تھا کہ یہ سرزمین حسین منگولیا اور زنگیریا کے علاقے شامل تھے دوسرے مذاہب کے اثرات سے بالکل بے بہرہ رہی ہو، اسلامی فتح کی وجہ سے ماوراء النہر کا علاقہ بدھوی یا نسٹوری یا یانی بلی تہذیب کا مرکز نہ بن سکا تھا، اور جہاں تک وسط ایشیا کا تعلق تھا اب ان مذاہب کا اثر اور سورج ختم ہو چکا تھا، مگر مسلمان ان مذاہب کو مشرق کی طرف بڑھنے سے نہ روک سکے اور ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اگر اورغین اقوام پر ایک عجیب و غریب چند روزہ اور ہم کامیاب غلبہ حاصل کر لیا، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ بغداد اور فرغانہ کی اسلامی فتح نے شمال مشرق کے دور افتادہ علاقوں میں مانوی نسٹوری مذاہب کے مہرست پھیلنے میں مدد دی تھی کیونکہ اس فتح کی وجہ سے ماوراء النہر کے بچے کچھ لوگ ان مذاہب خانہ بدوش اقوام میں پناہ گزین ہوئے تھے، اگر یہ صحیح ہے تو وسط ایشیا کی مہوم اور قسبی تہذیب نے "پرسر جان" (Parsa Jan) کی شکل میں ایک چیز باقی چھوڑی تھی اور یہ پڑھنے والے ان مسلمان فاتحین کی اولاد سے بدلائینے میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا، جنھوں نے پانچ صدی قبل اس تہذیب کو نیست و نابود کیا تھا، یہ امر مشکوک ہے کہ آیا چنگیز خان کی خانہ بدوش حکومت کے ابتدائی اصولوں میں نسٹوری اور بدھوی اثرات پائے جاتے تھے یا نہیں، کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حکومت کے مغرب میں جو خانہ بدوش اقوام تھیں، ان میں بھی یہ اثرات بالکل نامعلوم تھے، لیکن باوجود اس کے ان میں قوت تھی کہ وہ اس علاقے میں تمام علوم و فنون کے واحد اجارہ دار بن گئے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ جن قبائل میں یہ اثرات موجود تھے ان کو بالکل مساوی حقوق دے کر منگولی برادری میں شامل کر لیا گیا تھا، حالانکہ دوسرے دور افتادہ قبائل کو جنہیں یہ اثرات موجود نہ تھے اور جن کو چنگیز خان نے بعد میں فتح کیا یہ حقوق نہیں دیئے گئے تھے، اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ان کو اس وقت منگولی برادری میں شامل کیا گیا تھا جب کہ چنگیز خان کی سلطنت اس قدر وسیع ہو گئی تھی کہ محض خانہ بدوشانہ زندگی سے

کام نہ چل سکتا تھا، اور کسی نہ کسی قسم کے تمدنی اصولوں کی اشد ضرورت تھی، اس طرح پر اس مردہ معاشرت کے چند گناہ اور پریشان حال افراد کو ایک ایسی سلطنت میں غارت و افشام حاصل ہو گیا جو اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ دونوں برغلموں میں پھیل جائیگی۔

۱۲۰۰ء میں عرب فاتح یورپ میں نورس کی شکست کو بالکل فیصلہ کن مان کر آگے بڑھنے سے قسبی طور پر بازو اس ہو گئے تھے، اور ان کی اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ مغرب بعید کی عیسائیت برابر ترقی کرتی جاتی تھی اور اس وقت نہ صرف شباب پر پہنچ چکی تھی بلکہ مسلمانوں سے دست و گریبان ہونے کے لئے تیار تھی، اگر اس وقت مشرق بعید اور مغرب بعید کی عیسائیت میں اتحاد پیدا ہو جاتا تو بالکل ناممکن تھا کہ اس کے بعد مسلمانوں کی کوئی سیاسی اہمیت دنیا میں باقی رہ جاتی، اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں فریقوں نے جب کو ایک مدت تک ہلال کی دو شاخوں نے الگ کر رکھا تھا کس طرح تیرھویں صدی عیسوی میں اتحاد پیدا کرنے کی یکے بعد دیگرے کوشش کی تھی، اور ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئے تھے ۱۲۰۰ء میں خوارزم شاہ کی بربادی کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس ایک واقعہ نے ماوراء النہر میں پانچ صدیوں کی تمام اسلامی جدوجہد کو خاک میں ملا دیا ہے، اور اسی طرح ۱۲۰۰ء میں بغداد کی تباہی اور اس کے ساتھ عراق کی افسوس ناک بربادی سے مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی مرکز کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ اس کی تلافی ناممکن تھی، تاہم اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جس نے خاقان منگو کو ہلاک خان کی فوجی مہم بھیجنے پر آمادہ کیا تھا آرمینیہ کو چاک کا عیسائی بادشاہ بنیں (Hayton) تھا اور ممکن ہے کہ خود ہلاک خان کی نسٹوری بیوی نے اپنے خاوند کو اس بات پر آمادہ کیا ہو کہ وہ اپنا مقدمہ اکبیش دیا ہے فرات کے پار مسلمانوں کے آخر ہمار و ماویٰ یعنی مصر پر حملہ کرنے کے لئے نسٹوری سپہ سالار کت بغا کی سرکردگی میں بھیج دے، ۱۲۰۰ء میں کت بغانے دمشق پر قبضہ کر کے تھوڑی دیر کے لئے مانوفیسائٹ اور آرتھوڈوکس عیسائیوں کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا، اسی وقت یورپ کے صلیبی مجاہدین عکہ اور شامی



ساحل کے قلعہ پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے آخری اور انتہائی کوشش کر رہے تھے اور ان کو اس بات کا احساس تھا کہ اس بزرگ موقع پر پرتگیزیوں کی مدد سے ان کو کیا کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں چنانچہ اس سے قبل بھی پوپ انونسنٹ چہارم نے شکستہ زمین فراگووانی ڈی پیاؤ کرچی (Maricar Giovanni da) و فرانسس کارپینی (Francis Carpin) کو قرقزمین خاقان کے پاس بھیجا تھا اور اسی طرح سسٹہ لومین سینٹ لوی نے فراگوولیم آف روبرک (Maricar William of Ruben) کو بطور ایجنٹ روانہ کیا تھا۔ سسٹہ لومین مارکو پولو کا باپ اور چچا محض تاجرانہ حیثیت سے وہاں پہنچے اور پوپ کے نام خاقان کا ایک خط لے کر واپس آئے، شکستہ زمین وہ پوپ کا جواب لے کر عکہ کے قراقزم روانہ ہوئے اور سسٹہ لومین بحر ہند کے راستہ سے وٹیس واپس آئے، علاوہ ازیں سسٹہ لومین ارنلڈ خان ارغون نے ایک خط فرانس کے بادشاہ کو لکھا اور اس کے بعد سسٹہ لومین ایسا جی ایک خط اس کے بیٹے اچیتو (AULTAY) نے فرانس بھیجا۔ ان تمام واقعات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تیرہویں صدی عیسوی کے نصف اخیر میں مسلمانوں کے دو سب سے بڑے دشمنوں میں اتحاد ہو جانے کا قریب قیاس معلوم ہوتا تھا۔ آخر سسٹہ لومین ملک کی فتح اور شکستہ زمین شام پر منگولی حملوں کی ناکامی کی وجہ سے اس اتحاد کی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا۔

سسٹہ لومین کے درمیان خانہ بدوش قبائل کے آخری نقل مکان کے موقع پر اسلامی سلطنت اور تہذیب تقریباً بالکل تباہ و برباد ہو گئی، اور یہ حالت اس وقت ہوئی جب کہ شکستہ ملک ماوراء النہر میں اسلام سیاسی اور تمدنی لحاظ سے برسرِ حکومت تھا، برخلاف اس کے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس سے پانچ صدی قبل اس علاقے کو عرب فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرنے سے قاصر رہتے اور وہاں عربوں کے علیٰ الرغم ایک ایسی نئی اور طاقتور سلطنت اور تہذیب قائم ہو جاتی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تو سسٹہ لومین کے واقعات جو محض گجرات کی طرف اٹھ کر غائب ہو گئے مستقل طور پر تاریخ میں ثبت ہو جاتے، اسی طرح اگر یہ

فرض کر لیا جائے کہ شکستہ سے قبل دریائے فرات کے مغرب سے مسلمان نکال دیئے جاتے اور وسط ایشیا کی نئی تہذیب اس دریا کے کنارے سے لے کر چنگیز خان کی سلطنت کے جنوب مغربی کنارے تک پھیل جاتی تو اغلب یہ ہے کہ بدھوی منسطوری تہذیب جس نے بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں اپنی موہوم ہستی کے باوجود منگولوں پر اس قدر گہرا اثر کیا تھا اس وقت ان کو بالکل اپنے میں ضم کر لیتی اور اس کے بعد یہ لوگ اس کے نمائندے بن کر تمام دنیا کو فتح کرنے کے لئے آگے بڑھتے، ایسی حالت میں دریائے فرات کا مغربی کنارہ اسلامی سلطنت کی کاغذی سرحد قرار پاتا، اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس صورت میں یہ سرحد بھی بہت کم مدت تک قائم رہ سکتی، اگر ایسا ہوتا تو تیرہویں صدی عیسوی میں اسلامی تہذیب کا وہی حشر ہوتا جو گیارہویں صدی عیسوی میں بازنطینی تہذیب کا ہو چکا تھا، مشرق بعید اور مغرب بعید کی دونوں دشمن اسلام مل کر مسلمانوں کے آخری لہجہ و مادہ یعنی مصر پر حملہ آور ہوتے اور اسے برباد کر دیتے، مسلمان ایک محض گذشتہ اور مردہ تہذیب کے تبرک کے طور پر رہ جاتے، اور بیسویں صدی عیسوی میں ان کی وہی حالت ہوتی جو اس وقت آرمینیا اور شام کے مانوفیسائٹ اور منسطوری فرقوں کی ہے،

مذکورہ بالا وہ چند نتائج اور اثرات تھے جو شکستہ اور شکستہ کے درمیان ماوراء النہر اور فرانس کے عرب فاتحوں کی کامیابی اور ناکامیابی سے وابستہ تھے، اب اگر ممکن ہو تو یہ دیکھنا باقی ہے کہ عربوں کو ایک جگہ کامیابی اور دوسری جگہ ناکامیابی کیوں ہوئی، جسکی وجہ سے یہ عظیم الشان نتائج مرتب ہوئے عرب آخر فرانس کو فتح کرنے میں کیوں ناکامیاب رہے حالانکہ اسی زمانہ میں انھوں نے ماوراء النہر کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک زیر و زبر کر ڈالا، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ایسے اسباب موجود تھے جسکی بنا پر یہ قیاس ہو سکتا ہے، کہ اس وقت ماوراء النہر کی فتح فرانس کی تسخیر سے زیادہ مشکل تھی، اس سے قبل سسٹہ لومین جس طرح گیارہویں صدی میں سلجوقیوں اور تاتاریوں نے ایک ہی زمانہ میں بازنطینی سلطنت پر حملہ کیا تھا،



بھی دریا کے جھون و سجون کی وادی کو فتح کرنا آسان کام نہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ اسکندر رومی نے وہاں  
دو برس خرچ کئے اور آخر کار صرف صلح و آشتی کی محنت سے اس کو اپنا بناسکا حالانکہ اس کے مقابلے  
میں صرف پانچ برس کے اندر اندر وہ غیر مشروط طور پر درودہ و ایتالیہ اور لیبیا (LIBYA) کے  
شکستائوں سے لے کر ایرانی سطح مرتفع کے شمال مشرقی کنارے تک تمام سرزمین کا مالک بن گیا  
تھان دونوں فتوحات کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جس وقت اسکندر اعظم نے  
مادر اور النہر پر حملہ کیا ہے اس سے کم و بیش دو صدی قبل باختر اور سند کا علاقہ مستقل طور پر اشکانی سلطنت  
کا حصہ قرار دیا جاتا تھا اور اس نے ہونا یہ چاہئے تھا کہ ایران کے دوسرے صوبوں کی فتح کے ساتھ ساتھ  
اس صوبہ کی خود مختاری بھی ختم ہو جاتی ایسی فرق ہے کہ جو اس علاقے کو اشکانی حکومت کے دوسرے  
صوبوں سے ممتاز کرتا ہے

جب صوبوں نے اس علاقہ کو فتح کرنے کی کوشش شروع کی ہے تو اس وقت اس کی تسخیر میں اور  
بہت سی رکاوٹیں حاصل تھیں اور سلسلہ میں سب سے پہلے اس ملک کی سرحد کے قریب پہونچے اس  
وقت کم و بیش نو سو برس گزر چکے تھے کہ مادر اور النہر ایرانی سطح مرتفع سے نہ صرف آزادی حاصل کر چکا تھا بلکہ  
ہمیشہ اس کے ساتھ برسرِ پرخاش رہتا تھا، سرگب نے اپنی نئی کتاب میں نہایت وضاحت سے ساسانی  
ایران اور مادر اور النہر اور خراسان کے اس وقت کے سیاسی اور معاشرتی حالات کا مقابلہ کیا ہے جب  
کہ مؤرخانہ ذکر کرتے کشن، افلاوی اور ترکی قبائل کے زیرِ سیادت تھے، زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے  
کہ ایران سے ان علاقوں کی اسی علیگی کی وجہ سے صوبوں کو اس امر میں وقت واقع ہوئی کہ مادر اور النہر  
اور ایران کو ایک دوسرے میں منہم گردین سرگب کا خیال یہ ہے کہ دعویٰ عباسیہ کے دوران میں  
بھی مادر اور النہر اور خراسانوں سے بالکل الگ رہا تھا اگر یہ خیال صحیح ہو تو اس سے بخوبی ظاہر

The Area Congruent of Central Asia by Gibbon

ہو جائے گا کہ اس وقت بھی جبکہ مادر اور النہر عربی سلطنت کا ایک مستقل حصہ ہو گیا تھا اس نے اپنی جنگ  
انفرادی حیثیت کو برقرار رکھا تھا اور اپنے آپ کو دوسرے صوبوں کے ساتھ منہم ہونے سے بچایا  
تھا، دوسری طرف اگر غور سے دیکھا جائے تو یورپ کے مختلف ممالک میں اس سے کہیں زیادہ  
گہرا تعلق موجود تھا، ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں مغربی عیسائیت، لاطینی زبان اور  
رومنہ الکبریٰ کے باقی ماندہ آثار کی وجہ سے فرانس، اسپین اور شمال مغربی افریقہ کے ممالک  
ایک رشتہ میں منسلک سمجھے جاسکتے ہیں، اور باسانی تصور کیا جاسکتا ہے کہ مؤرخانہ ذکر و علاقوں  
کی فتح سے ہی فرانس بھی ایک ہی یوریش میں عربوں کے قدموں کے نیچے آجاتا، سلسلہ میں کوہستان  
پیرنیز کسی طرح بھی سیاسی یا تمدنی لحاظ سے ایرانی سطح مرتفع کے مقابلہ کچھ زیادہ ناقابلِ گذار نہ تھے  
فرانس کے مقابلے میں مادر اور النہر کو اور بھی بہت سے فائدے حاصل تھے، ممکن ہے کہ فوجی  
نقطہ نگارہ سے تانگ کی سلطنت محض بے کار ثابت ہوئی ہو، مگر مادر اور النہر اور خراسان کی  
خود مختار ریاستوں کو جو سیاسی مدد لگتا مارچنگ رنگن کے دربار سے مل رہی تھی وہ ہی ان کی  
ہمتوں کو بڑھانے کے لئے کافی تھی، خصوصاً اس حالت میں جبکہ عرب اس کی قدر و قیمت سے  
بالکل بے خبر تھے، اور اس لیے اس کو اس کے مرتبہ سے بڑھا ہوا سمجھا کرتے تھے، اس کے برعکاس  
سلسلہ میں کے نازک زمانہ میں یوٹریا، اکوٹین، اور آسٹریا کے باشندوں کو نہ تو بحیرہ روم میں کوئی  
مدد دہن کسی قسم کی سیاسی تائید قسطنطنیہ کے قیصر کی طرف سے حاصل تھی، اور اس لیے ان کو جنگ اور  
شکست کا خمیازہ خود ہی اٹھانا پڑتا تھا، خیرافہ اور آب و ہوا کے لحاظ سے بھی مادر اور النہر فرانس کی  
نسبت حملہ آور دن کے لئے زیادہ دشواریوں سے گھرا ہوا تھا، مادر اور النہر میں سرسبز و شاداب  
رزعی قطعات کا ایک غیر متناہی سلسلہ نہ تھا، بلکہ جا بجا ریگستان اور جنگل راستہ میں حاصل تھے،  
اس کے علاوہ یہاں ایسے زبردست اور ناقابلِ گذار دریا تھے جن کا مقابلہ گردن، لاکڑا اور سین



کسی طرح نہ کر سکتے تھے اور ترمذ کے مقام پر دریائے جیون کو عبور کرنے کے بعد مادار النہر کے  
دارالسلطنت محمد قندبک راستے میں زبردست پہاڑوں کو طے کرنا پڑتا تھا اس کے مقابلے میں نابولون  
سے فورس تک کوئی ایسا دشوار گزار راستہ نہ تھا اجماع تک سیاسی اتحاد کا تعلق ہے اس کا یہ حال  
تھا کہ فرینک قوم میں یہ اتحاد محض نام نہاد کے لئے تھا اور فوجی ضروریات کے لحاظ سے اس کا عدم  
اور جو دونوں برابر تھے اس طرح براس میں اور مادار النہر میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ مادار النہر کو  
اپنی مقابلہ بہتر تہذیب اور باشندوں کی قوت مقابلہ کی برتری کی وجہ سے فرانس پر کچھ نہ کچھ فوجیت  
ہی حاصل تھی

مذکورہ بالا بیانات سے مسئلہ زیر بحث کے حل کرنے میں مدد ملنے کے بجائے اور زیادہ وقت  
پیدا ہو جاتی ہے اس لئے کہ ہم یہ مان لیں کہ اس وقت مادار النہر کی تمدنی حالت فرانس کے  
مقابلے میں بہت بہتر تھی اور اس کو اس مسئلہ کا حل قرار دے لیں لیکن اس وقت یہ سوال پیدا ہوا  
کہ مادار النہر میں کیا کیا خوبیاں تھیں جو اس زمانہ میں فرانس کو حاصل نہ تھیں اس کا جواب شاید اس سوال کا  
لئے بیان پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ کا حقیقی حل یہ ہے کہ فرانس بنی امیہ کے دارالخلافہ یعنی دمشق سے مادار النہر  
کے مقابلے میں بہت دور واقع تھا اور اسی وجہ سے عرب اس کو فتح نہ کر سکے یہ صحیح ہے کہ دمشق سے نابولون تک  
فاصلہ خشکی کے راستے سے براہ شمالی افریقہ اور جبل الطارق مرو کے فاصلے کے مقابلے میں تقریباً دو گنا ہے لیکن وہ  
وجہ کی بنا پر اس واقعہ کی اہمیت بالکل جاتی رہتی ہے اولاً غارت کے مرکزے خشکی کے راستے کے علاوہ شمالی و  
مغربی محاذ کو ایک جہی راستہ بھی جاتا تھا یعنی بحیرہ روم کے ساحل پر اسکندریہ سے بارسلونہ کو حالانکہ ایسا کوئی  
راستہ شمال مشرقی محاذ کو نصیب نہ تھا یہاں یہ دریافت کرنا چاہیے سے خالی نہ ہو گا کہ اس نازک وقت میں قسطنطنیہ  
نے اپنی فوجی فوجیت کو کمان تک اہل فرانس کی مدد میں استعمال کیا تھا بحیرہ روم میں عربوں کی نقل و حرکت  
کو کمان تک روکنے کی کوشش کی تھی جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس امر کے متعلق اس وقت کوئی خاص شہادت

کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس سے قبل اور اس وقت بھی مادار النہر میں الاقوامی تجارت اور آمد و رفت کا راستہ تھا  
بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۱۴ محفوظ نہیں لیکن اگر بازنطینی اور عربی بحری قوتوں کے توازن کو خیال میں رکھیں تو بھی یہ بار نہیں  
کیا جاسکتا کہ قسطنطنیہ نے اس راستے کی بالکل نہ بند کر دی تھی اور جہاں تک اس راستے کا تعلق تھا یا خشکی کے راستے  
کے مقابلے میں زیادہ آسان اور مختصر تھا بہ نسبت اس راستے کے جو براہ خشکی شام سے خراسان جاتا تھا دوسرے یہ  
اور بہت مشکوک ہے کہ شام سے سرحد کے جنگی محاذوں کا قرب یا بعد جنگ پر کوئی اثر بھی پیدا کرتا تھا یا نہیں کیونکہ  
تاریخی شہادتوں سے اس کا کافی ثبوت مل سکتا ہے کہ بنی امیہ اور ان سے قبل اشکانی بادشاہوں کے زمانہ میں مرکز  
حکومت کی شاہی فوجیں شاذ و نادر ہی سرحدی جنگوں وغیرہ میں حصہ لیتی تھیں یہ جنگیں خواہ کتنے ہی برسے پیمانہ  
پر کیوں نہ بشروع کیجائیں محض مقامی فوجوں کے ذریعہ لڑی جاتی تھیں اور بنی امیہ کے زمانہ میں ان میں  
اکثر وہ عرب شامل ہوئے تھے جنکو اسی قسم کے جنگی کاموں کے لئے ان صوبوں میں بے پایا جاتا تھا ان کے بعد  
اگر ضرورت پڑی تو خود اس صوبے کے وفادار باشندوں کو بھرتی کر لیا جاتا تھا یہ یقینی ہے کہ صوبوں  
میں عربی فوجی عنصر بہت محدود تھا اور جب کبھی سپہ سالاروں کو مزید کمک کی ضرورت ہوتی تھی تو بجائے اس کے  
کہ وہ دمشق سے عربی فوج طلب کرین وہ خود اسی صوبے کے وفادار اور قابل اعتماد باشندوں کو فوراً فوج میں بھرتی  
کر کے اپنی ضرورت پوری کر لیا کرتے تھے چنانچہ جب قتیبہ بن مسلم نے مادار النہر پر اور عبدالرحمن الغافقی نے فرانس  
پر حملہ کیا ہے تو ان دونوں کی فوجوں میں عرب خال خال ہی دکھائی دیتے تھے اور قوت کا زیادہ تر انحصار خراسان  
کے ایرانیوں اور شمالی افریقہ کے بربروں پر تھا ان وجوہ کو خیال میں رکھتے ہوئے یہ کہنا ذرا بعید از قیاس معلوم  
ہوتا ہے کہ اسلامی مرکز سے مادار النہر کا قرب اور فرانس کا بعد عربوں کی کامیابی اور ناکامی کا اصل راز ہے  
سراپچ اسے آرگب سے مصنف نے مذکورہ بالا باتوں کا ذکر کیا تو انھوں نے یہ رائے ظاہر  
کی کہ دونوں وجوہ کو حد سے زیادہ اہمیت دینا درست نہیں اور یہ ممکن ہے کہ محاذوں کے بعد مسافت نے  
حقیقت میں عربوں کی جنگی حالت پڑ ڈالا ہو سترگب نے اس نوع کی تمام شہادتوں پر تفصیل کے ساتھ غور



حالانکہ فرانس اس وقت ایک نیم متحد ملک ہونے کے علاوہ تمام مہذب دنیا سے بالکل الگ ایک کونے میں پڑا ہوا تھا، اور اس پر کسی قسم کا بیرونی اثر نہیں پڑا تھا، اس فرق کو مسئلہ زیر بحث بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نہیں کیا، مگر ان کا خیال ہو کہ ہم کو یہ شکل ایسی کوئی شہادت دستیاب ہوگی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ عربوں نے شام اور اندلس کے درمیان آمد و رفت کے لیے کبھی بحری راستہ اختیار کیا تھا، اس کے برعکس اس امر کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں کہ وہ شمالی افریقہ کا خشکی کا راستہ استعمال کیا کرتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عربوں نے قسطنطنیہ کے مقابلے کے لیے بحیرہ روم میں ایک جنگی بیڑا تیار کر لیا تھا، لیکن انھوں نے اس بیڑے کو فرانس پر حملہ کرنے کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا، دوسری شکل یہ تھی کہ خشکی کے راستے میں ہمیشہ شمالی افریقہ کے بربروں کی طرف سے خدشہ رہتا تھا، اور مزید برآں اندلس میں بربروں کی فوجوں اور نوکباد کاروں کی وجہ سے ہر وقت امن میں خلل پڑنے کا اندیشہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اندلس کو بعض اوقات اپنے مال میں قبوڑ دینا پڑتا تھا، چاہے جنگ لوہے کے بعد کے نازک موقع پر شہر میں ایسا ہی کرنا پڑا تھا، اس کے مقابلے میں اگرچہ جنگ شہر لورس کے نسبت زیادہ خطرناک تھی مگر خلیفہ ہشام بن عبد الملک نے عراق کی فوجیں بھیج کر خراسان کو مستحکم کر دیا اور شاید شام سے بھی فوجیں بھیجیں اور اس طرح پر خطرہ کو زائل کر دیا، یہی حالت حارث کی بغاوت کے وقت ہوئی، یہ صحیح ہے کہ شہر لورس میں شامی فوجیں مصری کمک کے ساتھ افریقہ بھیجی گئی تھیں مگر ان کا مقصد اندلس کو تقویت پہنچانا نہ تھا، بلکہ محض بربروں کی بغاوت کو فرو کرنا تھا، بہر کیف اس فوج کو مراکش میں بربروں نے ایسی سخت شکست دی کہ اس کا نام و نشان تک مٹ گیا، سترگ کا یہ بھی خیال ہے کہ مادیار النہر میں عربوں کی تدمری اور گانار کو شش کی وجہ سے زیادہ کامیابی ہوئی، ایک طرف تو وہ ایرانی سطح رافعہ میں سے ہوتے ہوئے مادیار النہر کی طرف بڑھ رہے تھے، اور دوسری طرف فلج فارس کے راستے سے انھوں نے دریا کے سندھ کے میدان پر حملے شروع کر دیے تھے، چنانچہ جس وقت قتیہ بن مسلم دھاتیاشاہ میں فتوحات حاصل کر رہا تھا اسی زمانہ میں سندھ میں بھی غز

میں بہت اہمیت حاصل ہے، چونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے صدی عیسوی میں فرانس کی آبادی کے لیے کوئی خاص تجارتی دھچپی ایسی نہ تھی جس پر عربوں کے ساتھ ان کے تعلقات کا برابرا بھلا اثر پڑتا اس زمانہ میں ان کا کام صرف زراعت تھا، اور جو کچھ تھوڑی بہت تجارت فرانس اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں تھی وہ سب کی سب اطالویوں، شامیوں یا دوسرے غیر ملکوں کے ہاتھ میں تھی، اس کے بالکل برعکس جیسا کہ سترگ نے ظاہر کیا ہے مادیار النہر کی دولت کا تمام تر دار و مدار تجارت پر تھا وہاں کے بیشمار اور معمولی شہر محض نخلستانوں کی پیداوار پر زندگی بسر نہ کر سکتے تھے، کیونکہ خواہ آب پاشی کا طریقہ کتنا ہی اعلیٰ درجے کا کیوں نہ ہو نخلستانوں کی وسعت پانی کی کمی کی وجہ سے محدود تھی ایسے ملک کے لیے بین الاقوامی تجارت نہ صرف مزید دولت پیدا کرنے کا ایک مشغلہ تھی، بلکہ اسی تجارت پر وہاں کے باشندوں کی زندگی کا دار و مدار تھا، اس لیے جون جون عربوں کی ترک تار دینا بڑھتی جاتی تھیں ان کی تجارت کو نقصان پہنچتا تھا اور اسباب معیشت کم ہوتے جاتے تھے، جنگ کا ابتدائی زمانہ قتیہ بن مسلم کی فوجی فہم کے آغاز یعنی شہر لورس سے شروع ہوتا ہے، اس وقت سے لیکر ۱۱۷۱ء تک بظاہر کوئی نقصان تجارت کو نہیں پہنچا تھا، اور مادیار النہر کی خود مختار ریاستوں نے اس عوجی حملہ کو اس وجہ سے اُس وقت زیادہ اہمیت نہیں دی تھی کہ عرب ساسانیوں کے جانشین تھے اور مادیار النہر اور ساسانیوں کی تقریباً ہر وقت جنگ چھڑی رہتی تھی، ساسانی جنگوں کے دوران میں مدائن کی حکومت نے ایک سے زیادہ موقعوں پر مادیار النہر کی تجارت کو قید و بند لگا کر نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اُسے کوئی ہلکا صدمہ نہ پہنچا سکے تھے بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آگے بڑھ رہے تھے، اس کے برخلاف جنید کے خراسان میں تبدیل ہونے کے بعد عربوں نے صرف یہی کوشش کی کہ کھارح اپنے قدم سندھ میں جمائے رکھیں، اور انھوں نے اپنی تمام فوجی قوت مادیار النہر پر ختم کر دی ۱۲۱- (مصنف)



جو کہ سعدی تاجرون نے انتہائی جرأت اور عظمتی سے کام لیکر دوسرے راستے معلوم کر لیے تھے جن کے ذریعہ سے وہ اپنا مال بحیرہ روم کے خریداروں تک پہنچا دیا کرتے تھے، مثلاً ۳۱۰ھ میں خاندہ بن ترکون کے خاقان کی طرف سے ایک سفارت قسطنطنیہ کے دربار میں آئی تھی اس میں مادر النہر کا ایک بادشاہ بھی شامل تھا، سفارت کا مقصد یہ تھا کہ بحیرہ خزر کے شمال کا تجارتی راستہ ان کے لئے کھول دیا جائے تاکہ اس پر ایرانی سلطنت کا کوئی دباؤ نہ پڑ سکے، اگرچہ بظاہر اس سفارت کا افسر خاقان کا ایک نمائندہ تھا، لیکن ممکن ہے کہ وہ مادر النہر کے تاجردن کی طرف بھیجی گئی ہو، اس کے علاوہ مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب سے ان کی تجارت تھوڑی مدت کے لیے بند بھی کر دی جائے تو بھی مشرق بعید اور ہندوستان کی تمام تجارت کا اجارہ ان کے پاس رہ جاتا تھا، یہ تجارت اس قدر وسیع تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ ہر قسم کی معاشی مصیبتوں کو محفوظ رکھ سکتے تھے ۳۱۹ھ تک تو یہی حالت تھی، لیکن اس کے بعد اس میں اچانک تبدیلی واقع ہوئی، اور اس تبدیلی کی وجہ سے مادر النہر کی تجارت کو نقصان پہنچا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ۳۲۱ھ ۳۲۲ھ میں ترکون کے خاندہ بدوش قبیلے ترکیش نے عربوں اور مادر النہر کی ریاستوں کی جنگوں میں دخل دینا شروع کیا انھوں نے ان جھگڑوں میں دو وجوں سے دخل دیا، اول جنگ ننگن کے نمائندوں کی حیثیت سے اور دوسرے خود مادر النہر کے مددگاروں کے طور پر، اور جہاں تک عربوں سے لڑنے کا تعلق تھا انھوں نے اس کا پورا حق ادا کیا، سترو برس تک انھوں نے عربوں کو محض مدافعت پر مجبور رکھا، ان کو شکستیں دین اور آخر کار ان کو رفتہ رفتہ دریا کے جیچوں کے پار تمام قلعوں کو چھوڑنا پڑا، مگر مادر النہر کے باشندوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ حقیقت میں خود ترک ان کے لیے آخر ایک لاندہال مصیبت ثابت ہونگے، ترکیش برائے نام چین کی مذہب حکومت کے تحت تھے، مگر ان پر کسی قسم کی نگرانی چین کی حکومت کی نہ تھی، اور معلوم یہ ہوتا کہ اس موقع پر ترکیش نے

بالکل بن سر سے ہو کر ایسی ابتری پھیلائی تھی جو خانہ بدوش اقوام کے تمدن اقوام پر قابو پالینے کے بعد اکثر پھیل جایا کرتی ہے، مشرقی تجارت کے راستے پہلے مسدود ہو چکے تھے، اور جب ترکیش نے بالائی جیچوں کو عبور کر کے عربوں کو طحارستان سے باہر نکالنا شروع کیا تو تجارتی معاملات میں اور زیادہ ابتری پھیلی، اور مادر النہر اور ہندوستان کے درمیان تجارت کے راستے بالکل غیر محفوظ ہو گئے، اسی اثنا میں ترکیش کے بالادست چینی حکام اپنے ان مفسد باجگزاروں سے اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ جب اسد بن عبداللہ القسری نے ۳۲۵ھ کے آخر میں ترکیش کے خاقان کو حوزجان اور خراسان میں شکست دی تو چینوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ترکیش کی جمعیت کا خاتمہ کر کے تمام قبیلہ کو پراگندہ کر دیا، قرین قیاس بات یہ ہے کہ چونکہ مادر النہر کی تجارتی جماعتوں نے ترکیش کی وجہ سے نقصان اٹھایا تھا اس لیے چینی حکومت کی نسبت ان کو ان ترکوں سے نفرت تھی، اور یہی وجہ تھی کہ اسد اور اس کے جانشین نصر کی صلح و آشتی کی حکمت نے فوراً اپنا اثر پیدا کرنا شروع کیا، اور عربوں کو بہت جلد اس میں کامیابی حاصل ہو گئی،

۳۲۶ھ میں معلوم ہوتا ہے کہ طحارستان کے ایرانی ادارے کے ساتھ سمجھوتا ہو چکا تھا، بلخ جو اس سے قبل کی جنگوں میں تباہ و برباد ہو گیا تھا اب خود اسد کی نگرانی میں نئے سرے سے تعمیر کیا گیا، تاکہ عربی نظم و نسق کے مرکز کے طور پر مدد کا جانشین ہو سکے، یہ اسد کے ترکیش کو شکست دینے سے ایک سال قبل کا واقعہ ہے، اور اس جنگ کے دوسرے سال یعنی ۳۲۷ھ میں نصر بن سیار نے ایک اعلان کے ذریعہ سے عام معافی اور تمام حقوق دے کر اسد کا کام بالکل مستحکم اور مستقل کر دیا، اس سے قبل بھی عربی حکومت نے غیر عرب اقوام اور غیر اسلام مذاہب کے ساتھ ایک قسم کی خاص سماعت برتی تھی، مگر اس موقع پر نصر کا یہ اعلان خصوصیت کے ساتھ عربوں کی حکمت سے بالکل مستثنیٰ معلوم ہوتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو نصر نے بالکل نادانستہ طور پر اسکندر رومی



کی برودی کی تھی جس نے خود، جہاں تک ہم کو علم ہے، اس اشکانی بادشاہ کی حکمت عملی پر عمل کیا تھا جس نے سب سے پہلے ماوراء النہر کے علاقہ کو ایرانی حکومت میں ضم کیا تھا، بہر حال ۳۸۰ء میں نصر بن سیار نے ماوراء النہر کے باشندوں کے سامنے سیاسی غلامی، یا معاشی بربادی سے بچنے کے لیے ایک عزت آمیز طریقہ پیش کیا، ان سے یہ کہا کہ اگر وہ عربوں کی سیادت چند قابل برداشت شرائط کے ساتھ قبول کر لیں تو نہ صرف ان کی تجارت حسب سابق بحال ہو جائے گی بلکہ ان کو ایسی خوش حالی نصیب ہوگی جو شاید گذشتہ ہزار سال سے ان کو میسر نہیں آئی، اگر ایک مرتبہ وہ سیاسی اعتراضات جو اس علاقے کو عربی حکومت میں ضم کر دینے کے متعلق کئے جاسکتے تھے حل کر دیئے جائیں تو کوئی شبہ نہ تھا کہ اس انتظام سے ماوراء النہر کے لوگوں کو بہت سے معاشی فائدے حاصل ہو جائیں گے، کیونکہ ان کی جنوب مشرقی سرحد پر ایک مستقل فوجی محاذ کے بجائے ماوراء النہر کے تاجروں کے لیے ایک ایسا علاقہ تجارت کے لیے کھل جاتا جو خراسان سے لیکر بحیرہ روم تک اور بحیرہ روم سے بحر اوقیانوس تک پھیلا ہوا تھا، اس کے علاوہ عرب کے سیاسی بدبودن نے فوراً ان تجارتی علاقوں کو دوبارہ کھول دینے کی کوشش شروع کر دی جو وسط ایشیاء سے ہوتے ہوئے مشرق بعید کو جاتے تھے، چنانچہ بحر قزق کو دوبارہ فتح کرنے کے بعد (غالبا ۳۸۰ء میں) نصر نے ایک سفارت چین بھیجی اور اس کے بعد ۳۸۰ء میں اس سے بھی ایک زیادہ شاندار سفارت چین گئی، جس کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو تجارتی تعلقات کو باضابطہ طور پر مکمل کر دیا جائے، اس سفارت میں عربوں کے ساتھ نہ صرف سندھ اور طخارستان کے ایلمچی تھے بلکہ زابلستان، کشمیر اور ترکیش تک کے سفیر شامل تھے، ان کے علاوہ ۳۸۰ء اور ۳۸۵ء میں دو اور سفارتوں کو پتہ چلا ہے، زابلستان کے سفیروں کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی بری تجارت

سے سرگوب کی کتاب مذکور بالا صفحہ ۱۲۷

کے راستہ کو کھول دینے کی تدابیر اس سے پہلے عمل میں آچکی تھیں،

یہ تمام واقعات، جن پر سرگوب نے نہایت وضاحت اور تفصیل سے بحث کی ہے، اس امر کے ظاہر کر دینے کے لیے کافی ہیں کہ عربوں کو ۳۸۰ء میں ماوراء النہر کی تسخیر میں اس قدر آسانی کیوں ہوئی، اور یہی اسباب ہیں جنکی بنا پر ہم باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ عربوں کو فرانس کی فتح میں کیوں اس قدر تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں اور آخر ان کی تمام کوششیں رائیگان گیلین، اگونیون اور بنو سٹریا کے باشندوں کے سامنے کوئی ایسا تجارتی مسئلہ نہ تھا جسکی وجہ سے ماوراء النہر کے باشندوں کو مصیبتیں اٹھانی پڑیں، فرانس میں بیزنٹی تجارت کا تقریباً نام و نشان تک نہ تھا، اور اس لیے کسی بیزنٹی طاقت سے جنگ کے موقع پر وہاں کے رہنے والے اس قسم کے نقصان سے بالکل بے فکر تھے، وہ اپنی سیاسی آزادی کو قائم رکھنے کے لیے لڑتے وقت اس آزادی کے ساتھ ساتھ اپنے کھیتوں کی بھی حفاظت کرتے تھے، اور یہی کھیت تھے جن میں ان کی تمام دولت مخفی تھی، چونکہ جیسا کہ اس سے قبل ظاہر کر دیا گیا ہے کہ وہ لوگ زراعت پیشہ تھے، اس کے علاوہ جب انھوں نے اپنی بالادست حکومت یعنی اہل آسٹریا کو اپنی مدد کے لیے بلایا تو ان کو کسی ایسے حادثہ کا خطرہ نہ تھا جو ماوراء النہر کے باشندوں کو ترکیش کی مدد کی وجہ سے برداشت کرنا پڑا، اگر یہ تمام دلائل صحیح مان لیے جائیں تو آٹھویں صدی عیسوی میں ماوراء النہر کی اعلیٰ درجہ کی تمدنی حالت یا بالفاظ دیگر وہاں کی تجارتی ترقی میں عربی فتح کا کاراز مضمر ہے، اور اسی وجہ سے اہل ماوراء النہر نے وہ نہایت قیمتی اور پہلا موقع ایک نئی اور بالکل اچھوتی تہذیب قائم کرنے کا کھو دیا، اس کے برعکس فرانس کیونکہ نیم وحشی تھا اور کوئی تجارتی فوائد اس کو حاصل نہ تھے اس لیے اس نے اپنی خود مختاری کو قائم رکھا، اور ایک ایسی تہذیب دنیا کو دی جس کی ترقی اس وقت تک جاری ہے اور جس سے اس وقت ہم مستفید ہو رہے ہیں



## ڈنمارک میں علوم مشرقیہ کی تاریخ

مترجم مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی، رفیق دارالمصنفین

ڈنمارک میں مشرقی علوم کی تاریخ پر نظر ڈالنے کے لئے اس زمانہ کی طرف توجہ ہونا پڑے گا، جبکہ وہاں اصلاحات مذہبی کی ابتداء ہو کر پروٹسٹنٹ مذہب کی بنیاد پڑی تھی، اس مذہبی تحریک نے فطرت طبعیتوں کو تورات کی جانب متوجہ کر دیا تھا، اسلئے عبرانی زبان کی تحصیل ضروری ہو گئی تھی، شروع شروع میں عبرانی زبان کی تعلیم کے لئے یہاں ایک پروفیسر کا تقرر عمل میں آیا، پھر سترھویں صدی کے آغاز میں دیگر مشرقی علوم کے لئے ایک دوسرے، ہر کا اضافہ کیا گیا،

ڈنمارک نے مشرقی علوم کے لحاظ سے سولہویں صدی میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دیا، معمولی طریق پر کچھ ادبی آثار پیدا ہوئے، تقریباً یہی حال سترھویں صدی کا ہے، اس صدی کی سب سے امتیازی خصوصیت یہی ہو سکتی ہے کہ ڈنمارک کا ایک باشندہ ٹھیوڈور پٹرس نامی مشائے ۱۵۵۰ء یا ۱۵۵۱ء میں حکومت کی طرف سے مشرقی ممالک میں علمی سیاحت کے لئے بھیجا گیا، اس نے اچھی ممالک اور بالخصوص ہالینڈ میں جا کر عربی، حبشی، قبطی اور خصوصاً ارمنی زبان سیکھی، تورات کے چند اجزاء حبشی زبان میں شائع کئے اور ۱۶۶۶ء میں تورات کا جو ترجمہ مشرقی ممالک میں ارمنی زبان میں کیا جا رہا تھا، اس نے اس ترجمہ میں بھی بات بتایا،

اٹھارہویں صدی میں مشرقی علوم کا یہ امتیازی رنگ پیدا ہوا کہ ان سے یورپ کے ملکوں میں اور خصوصاً جرمنی میں دیگر علوم کے پہلو پہلو پھیلنے لگی، چنانچہ اسی صدی میں دو مشرقی ادیب، جاکوب ڈیٹلینگ اور تھامس کریمپن، اسی مرز میں پیدا ہوئے، یہ دونوں خاص ڈنمارک کے باشندے تھے،

ان کا مولد صوبہ سسٹونیک ہے، انھوں نے جرمنی میں تحصیل علوم کے بعد وہیں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا، اسی صدی میں پروفیسر کال نے کوپنہاگ یونیورسٹی میں قرآن مجید اور دیگر عربی علوم کا درس جاری کیا، ۱۸۵۰ء میں عربی نحو میں ایک کتاب شائع کی (۱۸۵۰-۱۸۵۱ء) میں پروفیسر روسے گارڈ نے عربی ضرب الامثال کا ایک مجموعہ تیار کر کے شائع کیا،

اٹھارہویں صدی ڈنمارک میں علوم مشرقیہ کے لحاظ سے علمی سفرون کی صدی ہے، مشائے ۱۸۰۰ء میں ایک بحری افسر فریڈریک لادنگ نارڈن نے مصر کی جانب کوچ کیا، اور وہاں جاکر وہاں کے مشہور مقامات، عمارات، اور قدیم یادگاروں کا نقشہ کھینچا، لیکن انھوں نے اس کی حیات میں اس کے سفرنامہ اور ان نقشوں کے شائع ہونے کی نوبت نہ آئی، اسکی وفات کے زمانہ ڈنمارک کے بعد ۱۸۵۵ء میں وہ سفرنامہ مصر و توبہ کے نام سے شائع ہوا، پھر اس کے دو ترجمے انگریزی میں ہوئے انگریزی سے وہ فرانسیسی زبان میں منتقل ہوا، اس سفرنامہ میں سب سے اہم ان مصری عمارتوں کا حال تھا جو وہاں نپولین بوناپارٹ کے حملہ سے پہلے موجود تھیں،

اسی طرح ڈنمارک کا ایک دوسرا شخص جارج ہیرسٹج ہو سٹ نامی اٹھ برس مراکش میں مقیم رہا، اس نے وہاں متعدد قابل قدر قلمی کتابوں کے نسخے حاصل کئے اور ۱۸۰۱ء میں اپنی دیسی ڈنمارک کی زبان میں حالات مراکش اور فارس، ایک کتاب شائع کی، اس کے ترجمے فرانسیسی اور جرمنی زبان میں ہوئے، ۱۸۰۹ء میں شاہ مراکش محمد بن عبداللہ کی سوانح حیات مرتب کر کے شائع کی،

اس صدی کی سب سے عظیم الشان نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ۱۸۰۶ء میں شاہ ڈنمارک نے ملک عرب کی جغرافیہ تحقیقات کے لئے ایک وفد جو پانچ آدمیوں پر مشتمل تھا مرتب کیا، ارکان وفد میں ایف، اس، ہارن، یو، فورسکل (فلینڈ) اور وی سی، نیو برڈرمن، تھے، چونکہ اس وفد کے تمام اخراجات شاہ ڈنمارک نے ادا کئے تھے، اس لیے یہ کارنامہ خاص حکومت ڈنمارک کی طرف منسوب



کیا پائے گا، اسکی مفصل رپورٹ سلسلہ میں جرمن اور فرانسیسی زبان میں شائع ہو چکی ہے،

علوم عربیہ کے لیے اٹھارہویں صدی کا نصف آخر کامیاب ثابت ہوا ہے، جی، ای، اڈلر (۱۵۶)

(۱۸۳۴) نے شاہی کتب خانہ کی قلمی کتابوں کا ایک مفصل مجموعہ کی صورت میں تیار کیا اور سلسلہ میں

بعض کتابوں کے متعلق مفصل معلومات شائع کیں، وہ ان کو فی کتبوں سے جو ان کے زیر تحقیق تھے گہری

دیکھی رکھتے تھے ان کی چند تصانیف "سکے اور ان کے کتبوں" پر شائع ہوئیں، اور نفوذ عربیہ کی تاریخ

کا نقشہ بھی تیار کیا،

ان کے اہم کارناموں میں (۱۸۹۹ء - ۱۹۰۹ء) تاریخ ابی الفداء کا پانچ جلدوں میں لاطینی ترجمہ

اور اسکی شاعت ہی، لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کے اصل ناشر مستشرق روسکی ہیں، اڈلر نے طباعت

کے وقت قلمی نسخہ پر محض نظر ثانی کی تھی، جس زمانہ میں اڈلر کے اہل یان شرق سے ذاتی تعلقات تھے،

انھیں "ایام میں تاریخ" روز پر چند مباحث اس نے شائع کئے تھے،

(۱۸۹۵ء - ۱۸۹۶ء) میں مستشرق جے این راموسین نے تاریخ غرب پر نو جہ مبذول کی (۱۸۹۱ء)

میں روس اور سوڈان، ماروسے سے عربوں اور ایرانیوں کے تعلقات پر ایک نادر کتاب شائع کی

پھر اس کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی زبان میں ہوتا گیا،

سلسلہ میں "تاریخ غرب قبل الاسلام" لکھی جس کے آخر میں ایک مفید ضمیمہ بھی تھا،

(۱۸۹۲ء - ۱۸۹۳ء) میں اسلامی تاریخ اور کوپنہاگ کے شاہی کتب خانہ کی قلمی کتابوں کے چند

مستند اقتباسات شائع کئے، آخر میں اس نے الف لیلہ کا ترجمہ شروع کیا تھا، لیکن دست اجل نے

فرصت نہ دی، انھیں دونوں دو دفناریوں نے علم آثار اور تاریخ مشرق کا مطالعہ شروع کیا، ان میں سے

ایک مشرقی، دیگر گنہریوں کے زمانہ کے مصری حالات پر کچھ کام کیا، اور (۱۸۹۱ء - ۱۸۹۲ء) میں مصر

کی بعض عمارتوں پر ایک کتاب لکھی اور (۱۸۹۱ء - ۱۸۹۲ء) میں قلمی کتابوں کی فہرست کے ضمن میں

قبل زبان کی بعض عبارتیں ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئیں اور ان پر حواشی لکھے، یہی وہ تصنیف ہے جس کے

متعلق علماء کا خیال ہے کہ یہ کتاب قطبی زبان کی تعلیم پر پہلی علمی تنقید ہے

دوسرا شخص مسٹر الفیت مونٹر ہے جس نے قدیم یونانی اور سامی عبارات، سکے، مذاہب، اور کتبوں

پر کافی مباحث شائع کئے، اسکی دو کتابیں ہمیشہ یادگار رہیں گی ایک اس نے کاتھلیکوں کے مذہب پر لکھی

ہے اور دوسری قدیم فارسی خط سہاری پر ہے، اس خط کی طرف ان کتبوں نے توجہ کو جلب کیا جبکہ یورپ

نے اصطر (پرسوپولس) سے نقل کیا تھا، چنانچہ مونٹر نے سہاری کتبوں پر ایک فاضلانہ تنقید لکھی، یہی تنقید

نے ان کتبوں کی تشریح و توضیح کا ایک راستہ پیدا کر دیا، ماہر لغات مشرقی، راسک نے جو اس کے قابل

میں کافی مهارت رکھتے تھے، صرف ازبان کی ادیسکے حسب مناسب ترتیب پر قناعت نہیں کی بلکہ خاص

خاص زبانوں کو معراج ترقی پر پہنچانے میں انھوں نے کافی جدوجہد کی،

فارسی اور ہندوستانی زبان کی تحصیل کے لیے فارس و ہند کا سفر کیا، وہاں بیش قیمت قلمی کتابیں

حاصل کیں جو آج تک کوپنہاگ میں محفوظ ہیں، لیکن افسوس کہ ان کے قوی نے جواب دیدیا اور ان کو اپنے چچ

کردہ مولود سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکا، سلسلہ میں شندی زبان (قدیم فارسی) پر ایک رسالہ لکھا اور قدیم فارسی

زبان کو جدید اسلوب پر تعلیم دینے کی بنیاد ڈالی، اور اپنے دوران سفر میں اصطر کے سہاری کتبوں کی بھی توضیح

کرنے کی کوشش کی،

راسک کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انڈو یورپین (سکرت اور یورپ کی زبانوں) پر کافی توجہ

کی، عربی کے سلسلہ میں اس کے معمولی کاموں میں یہ ہے کہ اس نے حکایات لقمان کو ایک تنقیدی تبصرہ

کے ساتھ شائع کیا،

علمی مطالعہ و تحقیقات کے وہ تمام کام جنکی ابتدا مسٹر راسک سے ہو چکی تھی وہ این، ویسٹر گارڈ

(۱۸۹۱ء - ۱۸۹۲ء) کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچے کیونکہ اس نے بھی ہندوستان اور ایران کا سفر کیا اور قلمی



کتابوں کے دو مقام سے جو اس کے نام سے پہلے تھے انہیں مکمل کر لیا اور فارسی مہاری کتبوں کی از سر نو نقلیں ہیں اس کے منقولہ مہاری کتبہ جدید مباحث کے لئے بے انتہا مفید ہوئے اور اس نے خود ان کتبوں کے حل کرنے میں پوری کوشش کی۔

اس نے ایران اور ہندوستان کی قدیم زبانوں کی جو خدمتیں کیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ دیارِ یون کی مہری کتاب (ژند اوستا کو اس نے چھاپ کر شائع کیا ہے اور سنسکرت زبان کے افعال کا ایک لغت اور اس زبان کی نحو پر ایک رسالہ لکھا اس کے بعد ایک اور ماہر الف، فاسیل (۱۸۲۱ء - ۱۸۹۱ء) پیدا ہوا جس نے اپنی عنان توجہ پہلوی زبان کی طرف منطقت کی، کیونکہ سترنگز المتوفی ۱۸۹۱ء نے پہلوی زبان کی چند عبارتیں شائع کیں تھیں اس لئے فاسیل نے بھی اس زبان کے چند اقتباسات جمع کیے ہیں کہ پہلوی زبان کے لغت کی تالیف کے لئے ایک ذخیرہ موجود ہو جائے چنانچہ ہمارے موجودہ زمانہ کے پروفیسر انڈرسن بھی اسی جذبہ میں مصروف ہیں امید ہے کہ عنقریب ان کے اعلیٰ خدمات کے نتائج منصفہ شہود پر آجائیں گے۔

سورنسن (۱۸۲۸-۱۹۰۲) ہندوستانی زبانوں اور خصوصاً سنسکرت زبان سے دلچسپی رکھتا تھا، مباحثات کے اشیاء پر مختلف اہم مباحث شائع کر چکا ہے۔

سراج راسموسن نے ڈنمارک کی زبان میں ہندی اور فارسی لٹریچر کے متعلق چند مضامین شائع کئے، انہیں فارسی کا مطالعہ کرتے کرتے اسلامی تصوف کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا، ۱۸۹۲ء میں مانٹا شیرازئی کے متعلق ڈنمارک کی زبان میں چند مباحث لکھے، مسر بی ٹاکسن نے جو فلسفہ ہند اور اس کے مذاہب کے اہر تھے فلسفیانہ ہندو مذاہب میں سے ایک مذہب پر حیکوینی کہتے ہیں ایک کتاب تالیف کی، نیز دوسرے مذاہب پر جنکی تعلیمات مختلف اسلوب سے نہایت دقیق ہیں ان میں لکھیں۔

ڈورڈ لہمان نے اصول مزدیہ (مجدوسی) کا مطالعہ کیا اور مستند صحیح حوالوں سے زروشت کی صلح حیات مرتب کی۔

ارکر کسپنس ماہر فارسیات نے ساسانیوں کی تاریخ کی ترتیب دی اور خاص طور پر بلا و فارس کے اسلامی عہد کے حالات کا مطالعہ کیا، عمر و خیام اور دیگر حکماء پر متعدد مباحث، سپرد قلم کئے اور مشرق کے علم الاضنام اور کہانیوں کے مطالعہ کا مشغول جاری کیا۔

ایف، ایم، خان مہرین (۱۸۲۶ء - ۱۸۹۹ء) مدت سے سامی زبان کے مطالعہ میں مصروف ہیں علوم اسلامیہ میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں، ۱۸۵۳ء میں انکی ایک کتاب "عربی علم معانی و بیان" پر جرمن زبان میں مچھی ہے، ان کے شغف علمی کے ثمرات عرب کے جغرافیہ دانوں کی کتاب میں ۱۸۷۶ء میں تیس الدین دمشقی کی ایک جغرافیہ کی کتاب شائع کی، (یہ اس کتاب کے علاوہ ہے، جو پروفیسر موصوف کی ڈنمارک کی زبان میں طبع ہوئی ہے) ۱۸۷۶ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوا، پروفیسر موصوف فلسفہ اسلامیہ کے محقق شمار کئے جاتے ہیں، اسکی شہادت ان مباحث سے ملتی ہے، جو موصوف نے ۱۸۷۶ء میں ابو الحسن اشعری پر لکھے ہیں ابن سینا پر بھی مختلف رسائل ڈنمارک اور فرانس کی زبان میں لکھے، خصوصاً رسائل ابی علی بن سینا، جو (۱۸۷۶ء - ۱۸۹۳ء) میں لیڈن میں طبع ہوئے اپنے دوران قیام مصر (۱۸۷۶ء - ۱۸۷۸ء) میں عربی کتبوں کو نقل کرایا، پھر ۱۸۷۸ء میں اس کا مجموعہ وضاحت اور ترجمہ کے ساتھ ڈنمارک کی زبان میں شائع کیا پھر موصوف کے بعد فرانسیسی زبان میں آیا، علاوہ ازیں مصر کی عامی زبان پر ایک تبصرہ شائع کیا۔

ان کے شاگرد مسٹر ادیسٹروپ (الموود ۱۸۷۶ء) نے موجودہ مشرقی علوم سے گہری دلچسپی پیدا کی، الف لیلہ پر چند مباحث لکھنے کے بعد دو سال مشرقی ممالک میں گزارے، موصوف نے اپنی اس سیاحت کا ایک دلچسپ سفر نامہ لکھا ہے، اور ممالک زیر سیاحت کا جغرافیہ لکھا ہے، اور ملک



کی عامی زبان میں حکایات و مشق و مشق کی مذهب اسلام کی تاریخ پر اپنی یادداشت شائع کی اور اسلام پر ایک کتاب لکھی اور عربی قصص و حکایات کے ترجمے چھاپے اور ان کے علاوہ اہل دین کی معلومات کے لئے وقتاً فوقتاً مشرق حالات پر رسائل اور اخبارات میں مضامین لکھا کرتے ہیں، ہرین کے جانشین مسٹر کے بول نے سامیون کی تاریخ اور زبان کے متعلق بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، وہ خصوصیت کے ساتھ عبرانی اور عربی زبان سے بچسپی رکھتے ہیں، تورات پر ان کی متعدد شرمین میں، علم خود تاریخ یہود اور ان کے ملک کے جزائیہ پر بھی کئی تصانیف ہیں، انکی مشہور تصانیف میں عربی اور عبرانی زبان کا لغت ہے، انکی ایک تالیف "سیرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)" ہے جو براہ راست عربی کتابوں اور محدثین (دکرام) کی تصنیفات سے ماخوذ ہے، اور جو ست و لہین ڈنمارک کی زبان میں شائع ہوئی ہے، حضرت علی کی بھی سوانح حیات لکھی، اور قرآن (شریف) کے متعدد پاروں کا ترجمہ ڈنمارک کی زبان میں کیا،

پروفیسر ڈبلو ایم، شیمٹ اشور (اسیریا) اور مصر کے قدیم آثار پر کامل عبور رکھتے تھے، انھوں نے اشور اور مصر کی تاریخ کے ساتھ چند کتبے شائع کئے جو آج تک ہمارے یہاں عجائب خانہ میں محفوظ ہیں اور قدیم عمارات کے حالات لکھے،

ایچ اڈالانگ نے مصری علم آثار پر چند ایسے مضامین لکھے جن سے مشکلات کا حل ہوتا ہے، بہتر ہے کہ ہم مشہور ماہر لغت ڈبلو، تھامسن کے خدمات کو بھی نظر انداز نہ کریں جنھوں نے قدیم ترکی کتبوں کو حل کر کے ترکی تاریخ میں کافی ترقی دی، وبلو، گرونچ نے چند مباحث ترک کی تلفظ اور لہجوں پر شائع کئے آج کل پروفیسر اسٹروپ ہماری یونیورسٹی میں ترکی زبان کی تعلیم دیتے ہیں، ہمارے یہاں جس ہمت و حوصلہ کے ساتھ مشرقی زبان کی تعلیم کا انتظام ہے اس کا پتہ ہمارے یہاں کے پروفیسروں کی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے ان دو پروفیسروں کے علاوہ جو قدیم عبرانی

زبان پر درس دیتے ہیں یونیورسٹی میں اس وقت پروفیسر انڈرسن، ہندوستانی زبانوں کی تعلیم میں مشہور ہیں، اور پروفیسر اسٹروپ اسلامی تمدن کے لئے اور تیسرے پروفیسر (اس مقالہ کا مؤلف) سامی زبان کی تعلیم کے لئے ہیں، امید ہے کہ عنقریب کوئی پروفیسر اشوری زبان کے لئے پروفیسر شیمٹ کی قائم مقامی کرے گا،

(مجلۃ المجمع العلمی العربی بیسان ۱۹۶۴ء)

# السَّيِّقِ

## جلد سوم

جس کے مقدمہ میں اولاً نفسِ مجرہ کی حقیقت اور اس کے امکان وقوع پر فلسفہ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ نظر سے مبسوط بحث و تبصرہ ہے اور اس کے بعد خصائصِ نبوت، یعنی مکالمہ الہی، وحی، نزول ملائکہ، عالم دیا، معراج اور شرح صدر کا بیان ہے، پھر وہ آیات و معجزات مذکور ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں مذکور ہے اور بعد ازیں وہ ہیں جو مستند روایات سے ثابت ہیں، پھر ہجرون کی غیر معتبر روایات کی تنقید کا باب ہے، اور آخر میں وہ بشاراتِ نبوی میں جو صحفِ سابقہ میں موجود ہیں اور جن کے حوالے قرآن مجید و حدیث میں مذکور ہیں اور آخر میں خصائصِ محمدی کا باب ہے،

قیمت درجہ اول ۵/۰۰ درجہ دوم ۳/۰۰

تقطیع کلان تعداد صفحات ۶۱۸

”منیجر“



# الحیص تنصیر

## سیلان بستانی

ماہ گذشتہ میں مشہور ادیب سیلان بستانی کے انتقال سے دنیا سے علم و ادب میں ایک بہت عظیم نقص واقع پذیر ہوا ہے مرحوم حکومت عثمانیہ کے دستوری اعلان کے بعد بیروت سے مجلس سبوتین ترکی کے بانی منتخب ہوئے پھر بعد ترقی کر کے وزارت کے عہدے پر سرفراز ہوئے، اسی اثنا میں جنگ عظیم چھڑ گئی چونکہ مرحوم جنگ میں ترکوں کے داخلہ کے مخالف تھے اس لیے انھیں اپنے عہدہ سے دست بردار ہونا پڑا پھر ترکی کی نشاۃ جدیدہ کے بعد انگورہ تشریف لے گئے لیکن نوجوانان ترک کے اصرار کے باوجود صنیعی کی بنا پر سیاسی میدان میں قدم رکھنے سے محترز رہے پھر اپنے آخری وقت امریکہ کے شامی دوستوں کی دعوت پر امریکہ تشریف لگے وہاں کچھ دن بھی نہ گزرے تھے کہ پیام اجل کو لبیک کہا، مرحوم چار قدیم اور چھ موجودہ زبانوں کے ماہر تھے، اپنے عالم شباب میں بطرس بستانی اور سلیم بستانی کے ساتھ مصافحت کی لائن میں کام کرتے تھے پھر ان دونوں کی وفات کے بعد دائرۃ المصافحت کے اتمام میں مصروف ہو گئے، لیکن صرف چند اجزاء لکھے مرحوم کا سب سے نمایاں علمی کارنامہ مشہور یونانی شاعر ہومر کی الیڈ کا عربی نظم میں ترجمہ ہے جو ۲۴۰ صفحوں میں تمام ہوا ہے، اور شروع میں ۲۰۰ صفحے کا ایک مقدمہ ہے جس میں تاریخ الیڈ، الیڈ، اکیڈوں کے ہاتھ آنا اور عربی اور یونانی شاعری کا موازنہ وغیرہ جیسے مباحث بہر قلم لکھے ہیں،

ترجمہ کے دوران میں مصر، عراق، ہندوستان، قسطنطنیہ، یونان اور دیگر ممالک یورپ اور امریکہ وغیرہ کی سیاحت میں مصروف تھے، اس سلسلہ میں مختلف ممالک خصوصاً یونان اور قسطنطنیہ کے ادباء و

علماء کی خدمت میں الیڈ کا ترجمہ پیش کر کے تبادلۂ خیالات کرتے رہے،

(الہلال مصر)

## جامع عمرو بن العاص

مصر کے اس سب سے قدیم جامع مسجد کی تعمیر سلسلہ ۳۳۰ھ (۹۴۳ء) میں حضرت عمرو بن العاص فاتح مصر کی نگرانی میں انجام پائی، اس کا سنگ بنیاد چار صحابہ حضرت ابوذر غفاری، حضرت ابو بصیرہ، حضرت محمد بن جزی، زبید بن جری، اور نبیہ بن صواب مہری کے مقدس ہاتھوں سے رکھا گیا، اس کی تعمیر اول کے وقت اس کا طول ۵۰ اور عرض ۳۰ گز تھا پھر سلسلہ میں اس کی وسعت ۱۱۶۲ اور ۵۰ گز ہو گئی اور اب ۱۱۸۰ اور ۲۴ میٹر ہے (ایک میٹر ایک گز ۳ گراں کا ہوتا ہے)

امیر اسامہ بن زید نے جامع مسجد کے اندر بیت المال کا دفتر قائم کیا اور سلسلہ میں وزیر ابو الفرج یعقوب بن کلس نے بیت المال کی عمارت کے سامنے ایک فوارہ بنوا دیا، پانی پینے کیلئے رخام کے ٹیکے بھی نصب کئے،

آٹھویں صدی ہجری میں جامع میں ۸۴ ستون تھے، جن میں سے "عمود سجون" اور محراب کے دونوں اور مغربی دروازے کے ستونوں کے متعلق عامۃ الناس میں عجیب و غریب خرافات پھیل گئے تھے جکی بنا پر وہ لوگ ان کے ساتھ طرح طرح کی حرکتیں کرتے تھے، وزارت اور دیوان اوقات نے ان حرکات کے سد باب کیلئے مختلف زمانوں میں ان ستونوں کو لوہے کی چادر سے گھیر دیا،

سلسلہ میں امیر مراد بیگ نے زکریا صرف کر کے اس مسجد کی دوبارہ تعمیر کی، اس کے بعد فرانسس نے مصر پر حملہ کیا اور اس سلسلہ میں جامع عمرو کی تخریب و انہدام کے جو جو واقعات رونما ہوئے وہ اباب تایرخ سے پوشیدہ نہیں، سلسلہ میں دیوان اوقات نے اس کی تھوڑی بہت دوبارہ



مرمت کی پھر سڑک سے ایک انجن "الجنیہ حفظ الآثار العسریہ" کے نام سے قائم ہوئی جو جامع  
عمر کی تجدید و مرمت کی طرف توجہ ہوئی، لیکن اپنی مالی مجبوریوں کی سبب پر کوئی نمایاں خدمت  
انجام نہ دے سکی،

اب شاہ مصر نے اس طرف توجہ کی ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ اس مسجد کو اس کی اصلی  
شہان و شوکت پر دوبارہ آئین، بلکہ ان کا یہ قصد ہے، کہ اس کی قدیم تعمیر میں بغیر کسی قسم کے  
تغیر و تبدل کے بعینہ قدیم عمارت دوبارہ قائم ہو جائے تاکہ اس طرح مسلمانوں کی ایک قدیم  
یادگار بھی باقی رہ سکے چنانچہ شاہ مصر نے ان معماروں کے لئے تین انعامات کا اعلان کیا ہے  
جو ایسی تعمیر کریں کہ قدیم عمارت کا نقشہ دوبارہ قائم ہو جائے پہلا انعام ۲۵ پونڈ دوسرا ۱۰۰  
پونڈ تیسرا انعام ۵۰۰ پونڈ کا ہے،

جامعہ صرف ادا سے نماز کا کام نہیں لیا گیا بلکہ یہ علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت کا  
ایک مرکز بھی بنی، اس میں سب سے پیشتر سید الشیخ مین سلیم بن عنترت نجیبی دعوے کیا کرتے تھے  
پھر سید الشیخ مین حیب امام شافعی مصریہ بنے تو انھیں اس میں درس و تدریس کے ۱۰۰ زائد  
لے امام شافعی نے بھی ان میں سے ایک زادیہ منتخب کر لیا، مقریزی کا بیان ہے کہ عبد الرحمن  
ابن الصائب نے جامع میں درس و تدریس کے چالیس سے زیادہ حلقے پائے یہ نظام مصر  
کی عام و بارشہ دستور کا ایک قلم ہے،

جب سرین حکومت فاطمیہ کا دور آیا تو خلیفہ فاطمی رمضان کے جمعوں کی نماز چار مسجدوں  
میں اس بنا پر پڑھتے تھے کہ جس مسجد میں خلیفہ نماز پڑھتا لوگ اسی میں ورد و رستہ سے آکر شریک ہوتے  
تھے، اس نے اس نے رمضان کے پہلے جمعہ کی نماز مسجد قاہرہ و دوسرے جمعہ کی جامع حاکم تیسرے  
کی جامع ابن طولون اور آخری جمعہ کی جامع عمرو بن العاص میں پڑھتا، اس کی اس تقسیم سے

جامع عمر کی رونق میں کمی آگئی،

پھر شہر فسطاط کے برباد ہو جانے کے بعد جامع عمر ایک صدی تک خالی پڑی رہی صرف  
رمضان کے آخری جمعہ کی نماز لوگ اسی میں پڑھا کرتے تھے،

جب محمد علی پاشا مصر پر حاکم ہوئے تو انھوں نے جامع عمر کی نماز مثل سابق جامع عمرو میں  
پڑھنی شروع کر دی اور اس پر ایک وقف بھی کر دیا جس سے خلیفہ اور موزن کی تنخواہیں وغیرہ  
نکلتی تھیں،

اور اب چند دنوں سے خود شاہ مصر جامع عمر کی طرف توجہ ہوئے ہیں، جس سے اس کی  
رونق میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، کیونکہ شاہ مصر کے ساتھ قاضی القضاۃ شیخ الازہر مفتی عبدال  
دزراہ اور دیگر اعیان مصر و عامۃ الناس سب کے سب اسی میں نماز پڑھتے ہیں،

امید ہے کہ شاہ مصر کی اس عنان توجہ سے مسلمانوں کی ایک قدیم مقدس یادگار کا احیا ہو جائے گا  
"المدال مصر"

## مدیر طبعیہ

جب محمد علی پاشا کے زمانہ میں مصری فوج جدید طریقوں پر آراستہ ہو گئی تو انھوں نے  
فوج میں ایک طبی جماعت کی ضرورت محسوس کی جو فوجی ضروریات میں کام آ سکے،

اس مقصد کے حصول کے لئے یورپ سے چند ڈاکٹر طلب کئے گئے، سب سے پہلے ڈاکٹر  
گلاٹ بک فرانس سے ۱۸۲۵ء میں مصر پہنچے، ڈاکٹر محمد علی اور فوجی جراحہ علی فر کے ساتھ کام  
کرنے لگے، لیکن اس طریقہ کار سے حالات سدھرنہ سکے اس لئے ڈاکٹر گلاٹ بک نے نظام  
حریریہ کے ساتھ فرانسیسی طرز عمل پر ایک طبی مجلس بنانے کی تحریک پیش کی جو فوجی شفا خانوں کو  
بحسن و خوبی چلا سکے چنانچہ پانچ اشخاص کی ایک مجلس طبعی مرتب ہوئی جو ڈاکٹر جراحہ اور دیگر موزنوں



پر مشتمل تھی، اور اس مجلس کی اعانت کیلئے چند دیگر فرامشی ڈاکٹروں سے استدعا کی گئی، پھر فوجی شفا خانہ کا ایک نظام مرتب کیا گیا جس میں مقامی اور قتل ہونے والے دونوں طرح کے ہسپتال تھے، اس ترتیب نظام کے بعد "شفا خانہ ابی زعبل" مقامی ہسپتال کے نمونہ کی حیثیت سے قائم کیا گیا،

ڈاکٹر گلاٹ کا بیان ہے کہ اس کے بعد انھوں نے ایک طبی مدرسہ کی بنا ڈالنے کی تحریک پیش کی تاکہ اس مدرسہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک کافی تعداد فوجی خدمات انجام دے سکے، محمد علی پاشا نے ڈاکٹر گلاٹ کی تحریک پر فروری ۱۸۷۰ء میں "شفا خانہ ابی زعبل" میں ایک مدرسہ طبیہ کے افتتاح کا حکم صادر کیا، اس کے ساتھ کمپوٹری کی تعلیم کے لئے ایک اور مدرسہ کا احاطہ کیا گیا، پھر دایہ کی تعلیم کے لئے دس سو ڈانی عورتوں کا داخلہ بھی عمل میں آیا، اور ان کے ساتھ دوجرم کی دایاں بھی داخل کی گئیں تاکہ وہ دونوں اس خاص درجہ میں فن ڈاکٹری اور جراحی کی تعلیم حاصل کر سکیں، جو مستعد بن کر کھڑے ہو گئے۔

مدرسہ میں سواڑہری طالب علموں کا داخلہ ہوا اور ان طالب علموں کی تمام ضروریات زندگی کی کفالت وسیع پیمانہ پر منظور کی گئی، ان کے طریقہ تعلیم کا ایک نہایت مکمل پروگرام تیار کیا گیا، دس دس طالب علموں کی ایک جماعت بنائی گئی جو ایک پروفیسر کے سپرد ہوئی، اسی طرح کمپوٹری کے اسکول کیلئے چودہ پندرہ سال کے بچوں کا داخلہ منظور کیا گیا، انھیں پہلے مادی حساب ہندسہ، ہیئت اور تاریخ کی تعلیم دی جاتی اس کے بعد کمپوٹری پڑھائی جاتی،

پھر کانچ پانچ برس کے بعد اس شفا خانہ سے منتقل ہو کر "قصر عیسیٰ" میں آگیا اور آج تک اسی میں قائم ہے، آج سے کچھ دن پیشتر حکومت نے اسے "جزیرۃ الروضہ" میں منتقل کرنے کا اعلان کیا تھا، اور اس لئے کچھ ضروری سامان بھی کر لئے گئے تھے کہ یکایک یہ ارادہ فسخ کر دیا گیا، پھر یہ تجویز

پاس ہوئی ہے کہ اس کے لئے "عباسیہ" میں عمارت تعمیر کی جائے قیام مدرسہ کے بعد اس کے سامنے دو اہم مسئلے پیش ہوئے ایک زبان کا مسئلہ اور دوسرا تشریح اجسام کا ڈاکٹر گلاٹ نے نہایت ہوشیاری سے یہ دونوں مسائل طے کر دیئے، زبان کا مسئلہ یوں حل ہوا کہ ہر یورپین فوجی کے لئے ایک ایک جزیبہ مقرر ہوا، پروفیسر ہیٹے اس ترجمہ کو اپنا لکچر سناتا اور سمجھاتا، پھر دونوں طلبہ کے سامنے آتے اور ترجمہ میں ایک ایک جملہ کا ترجمہ عربی میں کرتے جاتے جسے طلبہ اپنی اپنی کاپیوں پر نقل کرتے جاتے،

پھر تشریح اجسام کا مسئلہ علماء کبار کے فوجی جواز سے حل ہوا، ابتدا میں تشریح کی تعلیم خفیہ طریقوں سے دی جاتی رہی جب اون طلبہ کو مذہبی حیثیت سے کامل اطمینان ہو گیا تو اس کی تعلیم کھلے جاری ہو گئی،

ڈاکٹر گلاٹ کے عہد میں کالج کا نصاب تسلیم یہ تھا،

(۱) طبیات، کیمسٹری اور نباتات کے اصول، (۲) علم التشریح، (۳) آپریشن، (۴) جراحی یعنی علم ترکیب الادویہ، و طریقہ مطلب (۵) مادہ طبیہ (۶) حفظان صحت و طب شرعی، (۷) کمپوٹری،

دایہ کے زیر درس ذیل کے علوم تھے،

(۱) قواعد زبان عربی، (۲) فن تولید، (۳) عالمہ زچہ اور چھوٹے بچوں کی نگہبانی کے طریقے، (۴) مخصوص امراض نسوانی کا علاج، (۵) آپریشن کے مبادی (۶) پچھنا لگانا اور چھپک کے

نیکے لگانا، (۷) آن و دوائیوں کا علم جو روزمرہ استعمال میں رہتی ہیں،

مدرسہ کچھٹ اور طلبہ کی تعداد کی تفصیل یہ ہے۔

۱۳۹۰ء میں محمد علی پاشا کا آخری زمانہ مدرسہ کا بجٹ ۲۲۷۰ پونڈ تھا، طلبہ ۲۹۶، اساتذہ ۲۲



## انجمن علمیہ

ڈاک خانے کے ٹکٹ اس محکمہ کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور عام اشخاص کا خیال ہے کہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ محکمہ کو بتا دیا جائے کہ مکتوب کا خرچہ ادا کر دیا گیا ہے، لیکن گذشتہ صدی کے آخری حصہ سے ان ٹکٹوں سے دوسرے کام بھی لئے جانے لگے ہیں اور ان سے اس محکمہ اور حکومت کو بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے ہیں، بعض ٹکٹوں میں قدیم تصاویر، بہترین مجسموں کی تصاویر شائع کر کے ان کو عام مکتون تک پہنچا دیا، فرانس نے اپنے یہاں کے سالانہ کھیلوں کو مقبول عام بنانے کے لئے ان کے مناظر کے ٹکٹ شائع کیے، لیکن ان سب سے بڑھ کر ان ٹکٹوں سے جو فائدہ اٹھایا جا رہا ہے وہ اشتہار کا ہے، سب سے پہلے امریکہ نے اسکی ابتداء کی اور سوئٹزر لینڈ نے اپنے ٹکٹوں میں اپنے حسین ملک کے مختلف مناظر کو ٹکٹوں کے ذریعہ تمام دنیا میں پھیلایا، اس کو ایک میں قومی آرام و آسائش گاہ بنا دیا، اب اس محکمہ نے کارخانوں سے بھی ٹکٹ کے لئے اشتہارات لینا شروع کئے ہیں اور اس طرح ہزاروں روپے مفت میں آجاتے ہیں،

انگلستان کی مردم شماری کے متعلق بعض نہایت دلچسپ اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں، اور ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ بے جوڑ شادیان حرف ہندوستان ہی کے لیے لعنت نہیں ہیں بلکہ تمدن یورپ بھی اس میں گرفتار ہے،

سب سے زیادہ معر جوڑے تین ہیں، (۱) ۹۸ سال کا شوہر اور ۹۵ سال کی بیوی ہے اور دونوں کی عمر کا مجموعہ ۱۹۳ ہے، (۲) شوہر ۹۴ سال اور بیوی ۹۵ سال، (۳) شوہر ۹۹ سال بیوی

اور خدام ۱۰۱ تھے،

پس اول کے زمانہ میں بجٹ ۳۸۱۰ پونڈ اور طلبہ ۱۲۶ تھے، اس عید پاشا کے زمانہ میں طلبہ کی تعداد گھٹ کر ۶۹ ہو گئی، پھر ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۳ء تک طلبہ کی تعداد ۵۰ سے ۱۱۰ اور ۱۰۰ سے ۶۶ تک گھٹتی برکتی رہی،

ذیل میں ایک نقشہ دیا جاتا ہے جس سے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۳ء تک کے ہر سال کے طلبہ اور فارغ التحصیل کی مجموعی تعداد معلوم ہوگی،

سال	ڈاکٹری	طلبہ	فارغ التحصیل	کپوٹری	فارغ التحصیل
۱۹۱۳	۲۴۳	۱۲	۲۶	-	-
۱۹۱۴	۲۳۸	۲۰	۳۱	۲۰	-
۱۹۱۵	۲۳۶	۲۶	۲۶	۲	-
۱۹۱۶	۲۶۶	۳۱	۲۶	۵	-
۱۹۱۷	۲۶۱	۳۱	۳۹	۹	-
۱۹۱۸	۲۳۶	۳۰	۲۲	۱۰	-
۱۹۱۹	۲۳۶	۳۶	۲۲	۶	-
۱۹۲۰	۲۳۴	۶	۶	۱۱	-
۱۹۲۱	۲۶۸	۵۰	۵۰	-	-
۱۹۲۲	۳۲۹	-	-	-	-

غذایہ ایجنسی کے ذریعہ سے ۱۹۲۲ء تک واپس کی تعلیم حاصل کرنے والی عورتوں کی تعداد ۳۵-۲۰ کے درمیان رہی

یہ سب اعداد و شمار انگریزی میں دیئے گئے ہیں، ان کے اردو میں بھی اعداد و شمار دیئے گئے ہیں،



۹ سال

سب کس جوڑے بھی تین ہیں، ان میں شوہر اور بیوی دونوں ۱۶، ۱۶ سال کے ہیں، سب سے  
سفر شوہر کی عمر ۱۹ سال ہے اور بیوی کی، ۹ سال ہے، سب کس شوہر کا سن ۱۵ سال ہے اور سب سے  
کس بیوی کی عمر ۱۵ سال ہے، لیکن ان سب سے زیادہ دلچسپ وہ شادیاں ہیں جنہوں کی تفادیت کو  
ظاہر کرتی ہیں۔

شوہر ۲۰ سال بیوی ۱۰ سال شوہر ۲۰ سال بیوی ۱۵ سال،

۸۸ " " ۱۵ " " ۸۱ " " ۱۸ "

۸۳ " " ۲۰ " " ۸۸ " " ۲۲ "

یورپین خواتین کا ذوق سیاحت اور شوق تحقیق ہمارے مردوں کے لئے قابل عبرت ہے  
حال ہی میں لارڈ اور فورڈ کی صاحبزادی ڈارلہی ملز نے کردستان، عراق، وغیرہ کا طویل سفر صرف  
سے اختیار کیا تھا کہ وہ وہاں جا کر یزیدی فرقہ کے حالات کا مطالعہ کریں، یزیدی حلب سے پانچ  
سوسل فاصلہ پر رہتے ہیں ان کے اعتقادات میں عہد نامہ قدیم کی اکثر باتیں موجود ہیں، یزیدی  
مرد کی عورت کی پرستش کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ شیطان جب جنت سے نکلا لایا تو اس نے  
عورت کی عبادت اختیار کر لی تھی،

انسان کے تجربات جیسے جیسے بڑھتے جاتے ہیں، اس کے خیالات میں بھی تبدیلی ہوتی  
جاتی ہے، ڈاکٹروں کا عام خیال یہ تھا کہ ایک مرض کا بہترین علاج وہی شخص کر سکتا ہے جو اس  
مرض کا مخصوص دوا دے، لیکن اب یہ نظریہ باقی رہتا نظر نہیں آتا، امریکہ کے ڈاکٹروں کی رائے ہے،

کہ ایک عضو کی بیماری کے معنی یہ ہیں کہ تمام دوسرے اعضا بھی اس سے کم و بیش متاثر ہوتے ہیں، اس لئے  
ایک مریض کے لئے ضروری ہے کہ اس سے ہر مرض دہر عضو کے ماہر خصوصی کی توجہ حاصل ہو، چنانچہ انہوں نے  
اسی خیال کو مد نظر رکھ کر یہ طے کیا ہے کہ اب ہر مرض کا شفا خانہ الگ الگ نہ ہو بلکہ ایک ہی جگہ ہو، تاکہ  
مریض کو تمام ماہرین کی متفقہ مدد مل سکے، اس لئے انہوں نے واشنگٹن میں ایک نیا عظیم الشان اسپتال  
بنایا ہے، اس میں ان کا کالج بھی ہے اور ہر مرض کے تحقیقات کا کام بھی ہوتا ہے۔

متحدہ مغرب میں امریکہ کو دولت، علم، تجارت، تہذیب، وغیرہ کے لئے خاص امتیاز حاصل  
ہے، یورپ کا شاید ہی کوئی ملک ہوگا جسکی گردن اس کے بار قرض سے جھکی ہوئی نہ ہو، لیکن وہاں کی  
اخلاقی حالت تمام دنیا سے بدتر ہے، اس کا ثبوت وہاں کے ایک ذمہ دار انشا پر داز کے قلم کی چند  
سطرین دیکھی وہ لکھتا ہے کہ ہم اہل امریکہ اپنی زندگی کے چند حالات سے صحیح طور پر خائف ہیں جہاں  
ایک طرف ہماری دولت اور ہمارا اطمینان تمام دنیا سے بڑھا ہوا ہے وہیں ہمارے جبرائیم کی تعداد  
متحدہ دنیا کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتی، اور عہد موجودہ کے ہر ملک سے بہت زیادہ ہے،  
۱۹۲۱ء میں تمام انگلستان میں ۹۰ قتل ہوئے لیکن امریکہ کے صرف ایک شہر نیویارک میں انکی  
تعداد ۲۳ تھی اسی طرح گذشتہ سال لندن میں ۲ قتل ہوئے اور ان کے مقابلہ میں نیویارک کی  
تعداد ۲۶۲ ہے۔ . . . .

کیا اب بھی ہم اس تمدن کے برکات کی بارش کے متمنی رہیں گے؟

ہوائی جہازوں کے ذریعہ جو تصاویر لی جاتی تھیں وہ صاف نہیں ہوتی تھیں اور ان سے نقشہ  
صحیح طور سے بنایا جاسکتا تھا، لیکن اب بعض موجدین نے اس مشکل کو بھی حل کر دیا ہے اور ہر قسم کی



صحیح نقاد و پیر لیا سکتی ہیں۔

ماہرین ارضیات کا خیال تھا کہ جس وقت چٹانیں ابتداً بننا شروع ہوئی ہیں، اس وقت دنیا میں کوئی جاندار نہ موجود نہ تھی، مگر اب ڈاکٹر جان ڈبوا، گروڈز نے دعویٰ کیا ہے کہ اس وقت بھی جاندار مخلوق تھی، انھوں نے تجربہ اور مشاہدہ سے بتا دیا کہ قدیم ترین پتھروں میں وہ جراثیم موجود ہیں جو حیرتی مخلوق کی ابتدائی صورت تھی۔

انسان اندون کیڑوں کی دنیا میں رہتا ہے کہ اس وقت انکی کم از کم ۳ لاکھ قسمیں موجود ہیں جب انسان نے کھیتی شروع کی تو اسے ٹڈیوں سے واسطہ پڑا، وہ اتنی بڑی فوج کے ساتھ آتی ہیں کہ آفتاب چھپ جاتا ہے اور ہر زمین سے اُگی ہوئی چیز اس طرح تباہ کرتی ہیں کہ گویا کسی نے ایک بڑی مشعل سے سب کو جھلسا دیا، اور جمہوریہ ارجنٹائن میں تو ہر وقت ان کے حملہ کا خطرہ رہتا ہے اسی لیے وہاں ایک خاص محکمہ انکی مدافعت کے لیے قائم ہے، گزشتہ سال اس محکمہ نے ۳۵۰۰۰ ٹڈیوں کا شکار کیا تھا، لیکن قدرت اس سے بھی بڑی مہربان ہے اور اب ایک ایسے کیڑے کا پتہ چلا یا ہے جو ان کیڑوں تک پہنچتا ہے اس کے پردوں کے اندر انڈے دیتا ہے اس سے جو بچے نکلتے ہیں ان میں اتنا ہر موتا ہے کہ ان کے کاٹنے سے ہی ٹڈی فوراً مرجاتی ہے اور اس طرح ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ کیمین تشرذگی سے نقصانات کا سلسلہ برابر پڑھ رہا ہے اور ۲۰ سال کے اندر تقریباً لگن ہو گیا ہے۔

۱۲۔ ۱۹۳۵ء (۱۴۵۳ھ) ۱۳۔ ۱۹۳۵ء (۱۴۵۳ھ) ۱۴۔ ۱۹۳۵ء (۱۴۵۳ھ) ۱۵۔ ۱۹۳۵ء (۱۴۵۳ھ) ۱۶۔ ۱۹۳۵ء (۱۴۵۳ھ) ۱۷۔ ۱۹۳۵ء (۱۴۵۳ھ) ۱۸۔ ۱۹۳۵ء (۱۴۵۳ھ) ۱۹۔ ۱۹۳۵ء (۱۴۵۳ھ) ۲۰۔ ۱۹۳۵ء (۱۴۵۳ھ)

ایک بیسی

## خیالاتِ عزیز

جناب عزیز لکھنوی،

دیکھنا اوس کی طرف بسودہ رنگ رخسار آفتاب آلود ہے  
تاب کس کو داستانِ دل سے حرفِ عشقِ خون آلود ہے  
ایک اک ذرہ یہ عبرت کی نظر یہ نشانِ ہستی بے بود ہے  
بوسے خون آتی ہوا نوسے مرے گفتگوئے دل جگر آلود ہے  
انحصار سرزمینِ کعبہ کیا، ایک اک ذرہ یہاں مچوٹ ہے  
کو چھ قاتل میں اشرے ہجوم ہر طرف سے راستہ مسدود ہے  
حسن ہی اک شعلہ پر پیچ و خم میری ہستی ایک موجِ دود ہے  
ظلم اتنے انتہا جس کی نہین، پھر بھی اوس سے دل مرا خوشنود ہے  
حاکمِ ارباب و فاسے محرز دیکھ لے دامنِ غبار آلود ہے  
لے مدد دل سے دماغی کام میں بیخیز دنیا ترمی محدود ہے  
مخملِ دنیا کے فانی رات دن زمزمہ سنج ہوا موجود ہے  
سانس کا باقی ہے جیتکا سلسلہ عافیتِ دل کے لیے مفقود ہے  
تو بلجائے تو پھر کیا چاہیے اور کیا تیرے سوا مقصود ہے



# اوراقِ پکنیہ

## صدنیات

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب رضوی ایم آر اس ایف اے

## (۹۱) دیوان آفتاب، انوار

ظہیر الدین بابر سے لیکر ابو ظفر بہادر شاہ تک تمام مثل سلاطین صاحب سیف و قلم رہے ہیں جنکی جنگ کی دھمکی گیری و معدلت گستری کی شاندار یادگاروں کے ساتھ ساتھ ان کی انشا پردازی، معجز نگاری و تاریخ نویسی کے لازوال کارناموں سے صفحاتِ عالم، الامال ہیں۔

ابو المظفر مجاہد الدین محمد شاہ عالم بادشاہ اس زینہ کی سولہویں سیر می پر تھا، جس قطعہ خاک پر بیٹھ کر ذیل کی غزل اس نے لکھی تھی اسی کے ایک گوشہ (صحن خلع فرخ آباد) میں وہ آج تک محفوظ ہے، اس کا کلام کچھ تو شاعر کے بعض تذکرہ نگاروں میں پایا جاتا ہے اور کچھ اشعار پرانے لوگوں کی زبان پر باقی ہیں، لیکن کتب خانہ صدر کوٹاہ بہت سے (فارسی درختہ کے) کلمات خسروانہ کی نگہداشت و حضانت کا فخر و شرف حاصل ہے جو طبع و اشاعت کی گرانہاری سے اب تک آزاد و محفوظ چلے آتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ انسان کی زبان دل کا آئینہ ہے اور راز ہائے فطرت کی بہترین ترجمان، شاہ عالم کی اکثر غزلیں اسکی سرگزشتِ مظلومی اور پر مصائب سوانح حیات کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں، اسکی یہ رباعی زمانہ غزل

سے بعض مژدہ تاریخین اور واقعات و حالات، از قیدہ مسئلہ (۱۵ جون ۱۹۲۵ء) سے دہلی سے نکلتے ہوئے ۱۱۶۲ھ ۱۷۵۰ء

تنگ ہے منار کیا قبل موت  
خلفت دنیا مگر بے سود ہے؟  
کشتہ صد تیغ ناکامی غمیز  
شکر ہے حاسد نہیں محسوس ہے

## جذباتِ ہادی،

جناب سید محمد ہادی بھلی شہری دکیل علی گڑھ،

ہو بھلا کیونکر زبان کو حوصلہ تقریر کا  
زندگی میری ہے نقشہ عالم تصویر کا  
رائیگان ثابت ہوئی فراموشی ہر جذبہ  
اک پیام مرگ ہر قطرہ تھا جوئے شیر کا  
ایک دنیا سے فراغت ہو ہی سیر کیے  
لوگ کہتے ہیں جسے حلقہ مری زنجیر کا  
خون دل سپیکے نہ کیوں بن سکے انک بننا  
زخم نے مدت میں منہ دکھا ہی اسکے تیر کا  
دیکھتا ہوں نقش پا اٹھ اٹھ کے ہر گہر کا  
مبار جذبے ل کے حوصلے تو دیکھئے  
میری خاموشی میں بھی اک لطف ہو تقریر کا  
میرا بزدان ہے افسانہ رنج و راق  
ہر قطرہ پر اسکی دھوکا تھا مجھے اک تیر کا  
ابو ہے ہر آہ اک شکوہ مری تقدیر کا  
اعتبار کا دش غم کا تماشہ دیکھئے  
خواب اکثر دیکھتا ہوں خانہ زنجیر کا  
ابو ہے ہر آشک سے فاش کستل کا  
غم محبی کو دیدیا اور دن کی بھی تقدیر کا  
میں رہیگا خیر جو کچھ ہے مری تقدیر کا  
میں پابندی رہائی میں بھی کرتا ہوں ادا  
خیر لوہا ہو گیا لکھا مری تقدیر کا  
کون ہو میرے سوا دنیا میں ناکام حیات  
دیکھتا رہتا ہوں منہ مڑ کے ہر گہر کا  
نیش و نوش زندگی دو دن ہیں اسکی نگہ میں  
خون رسوائی مجھے رہنے نہ دیتا چین سے  
ہے مری افتادگی کی عجیب شکل میں جان  
غم نصیب کے تقاضوں کا نتیجہ یہ ہوا  
میں تو ہادی کے یا تھا نزل و غم شمع

میرا بیٹا بھی ہے اک دھوکا مری تقدیر کا



کی مشورہ ہے

صبح اٹھ جام سے گزرتی ہے ، شب دلا رام سے گزرتی ہے  
عاقبت کی خبر خدا جانے ، اب تو آرام سے گزرتی ہے

انخطاط شباب تھا کہ اسکو اپنے باپ (عزیز الدین عالمگیر ابن جہاندار شاہ) کے سایہ شفقت اور  
ماتے زینت محل (رانی بلال کنور) کی انغوش عاطفت سے جدا اور شاہ جہان آباد کیسے ہمد عیش و عشرت سے  
دور ہونا پڑا۔ سمارن پور، فرخ آباد، بدایون، بریلی، لکھنؤ کی سرزمین نے اسکی آوارہ گردی و خاک بیزی کے لیے  
دامن پھیلا دیے۔ عظیم آباد چنہ میں میر جعفر کے غاشیہ دولت یا خزان نعمت سے زلزلہ ربائی کر رہا تھا کہ یکایک تفریر  
آئی نے پٹا کھایا اور <sup>۱۱۴۳</sup> ۱۱۴۳ھ میں عالمگیر ثانی نے اپنے وزیر عماد الملک کے ہاتھوں دلی میں جامہ خونیں زیب  
تن کیا، شاہزادہ نے جواب تک عالی گوہر تھا وہیں (عظیم آباد میں) اپنے بادشاہ ہونے اور شاہ عالم لقب اختیار  
کرنے کا اعلان کیا، پھر عماد یابا دل نا خواستہ نواب شجاع الدولہ وزیر کی قیادت و سرکردگی میں ایٹ اندیا  
کپیتی سے بکسر میں معرکہ آرائی کی اور شکست کھائی اس پرشیت کی ستم ظریفی دیکھتے کہ یہ چارے کو اپنے فریق  
مقابل کے ایک رکن یعنی مظفر منصور میر منرد کو شقہ آہستہ قلم خاص سے لکھنا پڑا، اسی فتنہ فوج کے پیچھے پیچھے  
وہ کمال الحاح و التیام کے ساتھ آہ آباد آیا اور دس گیارہ سال تک کمپنی کا (چوبیس لاکھ سالانہ کا) پیشن خوار  
بلکہ (حقیقتاً) کرنل اسمتھ کی قید و بند میں (قلعہ آہ آباد میں) گرفتار رہا، تین سرسبز و سیر صبل صوبے (بنگلہ، بہار  
۴ اعلان تخت نشینی بہار جادی الاول ۱۱۴۵ھ (۲۵ دسمبر ۱۷۳۱ء) جنگ بکسر ۱۱۴۷ھ (۲۲ اکتوبر ۱۷۳۲ء) -  
۵ حاکم سندھ و دہلی و بنگال و بہار و سرزمین و غیرہ ۱۱۴۵ھ (۲۵ اگست ۱۷۳۱ء) قیام آہ آباد تا ۱۱۴۸ھ (۱۸ اکتوبر ۱۷۳۳ء) داخلہ دہلی عید رمضان ۱۱۴۸ھ  
۶ (۱۵ جنوری ۱۷۳۴ء) گرفتاری بدست غلام قادر خان و معز دلی شاہ عالم و تخت نشینی شاہزادہ بیدار بخت ابن احمد شاہ ۲۲  
۷ ۱۱۴۸ھ (۱۵ جولائی ۱۷۳۴ء) - ۱۱۴۹ھ (۱۲ اگست ۱۷۳۴ء) - باز تخت نشینی بادام پور  
۸ ۱۱۴۹ھ (۱۲ ستمبر ۱۷۳۴ء)

اور ایسے چکی آبادی تین کروڑ نفوس اور سالانہ آمدنی چار کروڑ روپیہ تھی <sup>۱۱۴۵</sup> ۱۱۴۵ھ میں انگریزوں کے نذر کئے  
تو اسرو جس سے ہر اسے نام آزادی مرحمت ہوئی اسطنت کے بارہویں سال یعنی <sup>۱۱۸۵</sup> ۱۱۸۵ھ میں اس نے بکسر  
کی دستگیری و مساعدت سے خود کو تخت پر تنگن پایا، اس خواب مسرت سے آنکھ بھی کھلنے نہیں پائی تھی کہ  
وہ مرہٹوں کے سخت گیر و استخوان شکن پنجہ میں اسیر ہو گیا چکی ترکنا زکا اس زمانہ میں تقریباً سارا ہندوستان  
جوانگاہ بنا ہوا تھا اور تیمور صاحب قرآن کے کم مہمت و کوتاہ عقل اخلاص کے تاج و سر پر چکی دستبردست  
پادشاہ اور ہر جہت شامت زدہ زندگی کی یہ منزل کسی نہ کسی طرح ختم پرائی تو بد نصیب پر ایک اور طاقتور اور  
غارتگر گردہ نے دست بیدار دراز کیا، یہ افغانہ و ابدالی تھے جو سبکیات علیا اور مخدرات غظمی کے زیور اور  
قیمتی بلبوسات اور محل قلعہ کا تمام بچا کچی نقری ٹھکانی ساز و سامان بھی لوٹ لے گئے، خود بادشاہ کے سامنے  
جوان بخت جہاندار شاہ ولیعہد، مرد اسلیمان شکوہ اور مرزا اکبر شاہزادوں کو لاکھوں سے روپے کو بکر کے  
قریب ہلاکت پہنچا دیا، ایک سو اسی (۱۸۰) محلات کی نہایت برحی و بے دردی کے ساتھ بے حرمتی اور  
بارپیت کی ویدار بخت کو شاہ جہان کے تخت پر بٹھایا، چلتے چلاتے <sup>۱۲۰۲</sup> ۱۲۰۲ھ میں غلام قادر خان روہیلہ کو  
خبر سے معروض خان رسیدہ بادشاہ کو بھارت کی دولت سے بھی محروم کر تا گیا، شاہ عالم کی زارنالیان اور شاہ  
اعوان و انصار (انگریزوں، مرہٹوں وغیرہ) کی طرف دست نظم بڑھا کر فریادری کے لئے بلانا اوس کی  
درد انگیز شاعری کا زندہ جادو ثابت ہوئے، خدا خدا کر کے مرہٹوں نے بادشاہ کو اس کنج نفس سے جس میں  
تابینا کرنے کے بعد غلام قادر نے بند کر دیا تھا رہائی دی، پھر جب انگریزوں نے مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت  
کو رد کا اور انکی ملک گیری کی ہوس کو ستمبر ۱۱۸۵ھ میں ختم کیا، تو جنرل لارڈ لیک کے ایک گوشہ چشم ہر انتفا  
سے دلی کے تخت پر شاہ عالم پھر ایک بار بٹھا دیا گیا، لیکن کیفیت یہ تھی کہ وہ بادشاہ جس کے پرداد کے قبضہ  
میں صوبیات بنگ و دکن و قندھار وغیرہ ملا کر بیس صوبے اور ایک سٹونوے سرکارین تھیں اس کے  
نسبت یہ مشہور تھا کہ "عللاری شاہ عالم از دہلی تا پالم" حویلی پالم دہلی سے پہلا اسٹیشن ہے،



اس کے گزرا سے کہ یہ کسی وقت چھبیس لاکھ سالانہ تھا مقتول ملک بھی چھوڑ دیا گیا تھا جس کو وہ اپنی نسبت اندیشی یا سور تلبر سے کھو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں شاہی خاندان میں رشاہ عالم کے ابا دن لڑکے لڑکیاں شمار و قلعہ بند ہوئے چکی تھو وہ پندرہ روپیہ ماہوار فی کس مرہون نے مقرر کی اور خود بددلت و اقبال کے اخراجات کے لئے سترہ ہزار ماہانہ مرہون کے دست اقتدار سے نکالنے کے بعد سرکار انگریزی نے بارہ لاکھ سالانہ پیش منقر کردی تھی۔

۴ رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ (۱۹ نومبر ۱۸۵۷ء) کو انٹی سال نو ماہ بین یوم کی عمر میں ادنیاس برس سلطنت کرنے کے بعد شاہ عالم نے اس دینائے دنی کو خیر باد کہا اور عالم آشوب انقلاب و صوبات سے ہمیشہ کے لئے رستگاری پائی، دہلی میں موتی مسجد کے پاس شاہ عالم بہادر شاہ کے حجر کے متصل جو ارمزار خواجہ قطب الدین بختیار میں پیوند خاک ہوا۔

یہ بھی خیال رکھنے کی بات ہے کہ اس کے زمانہ میں انگریزوں نے انتظامات جہانبانی دامور عدالت میں اہم و قابل یادگار مسلا حات کی تھیں، ناک، کان، ہاتھ کاٹنے کا دستور جو مرہون کے وقت میں تھا ایک قدم بند کر دیا گیا، قید و جرم کی سزائیں اس کے بجائے قائم ہوئیں، ایک عضو کاٹنے کے بدلے سات برس اور دونوں ہاتھ کاٹے جانے کے عوض چودہ سال کی قید مقرر کی،

شاہ عالم کو سخن اور اہل سخن سے بنایت الفت تھی، تاج و تخت پانے کے ساتھ ہی تمام شعرائے دہلی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے، مرزا جعفر علی حسرت اس گروہ کے ختم و داغ تھے، انھوں نے افغانہ کے حملہ اور پائے تخت کے ماتحت و تاراج ہونے کے تمام واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا پروردگار و مرثیہ نظم کیا تھا، خیر الدین آبادی نے بھی غنی مصائب و آلام سے متاثر ہو کر خاندان تیموریہ کے عبرت خیز حالات کو

لے لکھنی تھے، حکیم ابوالخیر دہلوی سے غفلت رشید، اور سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد، شیخ قند بخش جرات، ایک خواجہ تاش تھے، باوجود دنیا ترک کردی تھی،

عبرت نامہ کے نام سے قلمبند کیا ہے،

زیب دو اور رنگ و وہیم ہونے کے بعد عالی گوہر نے "آفتاب تخلص اختیار کیا اور اقلیم سخن پر ہرگز ہو کر چپکا تھا،

### از و است

کہو میل کو لیجا دے چمن سے آشیانہ اپنا  
پڑ سے گر صد ہزار افسون، نہ ہو گا باغبان اپنا  
اٹھا کر لیچلی میل چمن سے آشیانہ اپنا  
کہا گل سے کہ مے یہ بے وفا ہے مگلا اپنا  
ہوئی جب باغ سے رخصت، کہا روڑو یا تمشت  
لکھا تھا یون کہ فصل گل میں چھوڑین غما اپنا  
ارے صیاد! یون چا تو جی اور جان کا حاضر  
و لیکن طوق قمری کی طرح کر کے نشان اپنا  
دراختا ہو جی اس میل بے کس کی غربت  
کہ گل کے اس سر پر یون لٹا یا خاندان اپنا  
چلی جب باغ سے میل لٹا کر خاندان اپنا  
پنچھوڑا ہائی میل نے چمن میں کچھ نشان اپنا  
نہ تو نے گل کیا اپنا میل! باغبان اپنا  
چمن میں کس طرح سیٹی بنا یا خاندان اپنا  
یہ حسرت رہ گئی، کس کس سے زندگی کرتے  
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغبان اپنا  
الم کر اس طرح ردی کہ رسوا ہو گئی میل  
ڈوبایا ہائے آنکھوں نے تمامی خاندان اپنا

مگر دل سے بنا رکھنا علی گوہر سے پیارے کو

وہ حکم شاہی رکھتا تھا، دے تھا مہربان اپنا

یہ دو غزلین زمانہ بادشاہی کی ہیں

(۱)

عاجز ہوں ترے ہاتھ سے کیا کام کروں میں  
کو چاک گریبان، تجھے بدنام کروں میں  
دم رکھتا ہوں تہذیب کو کہ تو مجھ سے  
پر دیکھ تو کیسا ہی تجھے رام کروں میں



ہے درجہاں میں مجھے سب شکوہ تھی سے  
کیون کچھ گلہ گردش ایام کردن میں  
حیران ہوں ترے ہجر میں کس طرح سے پیسا  
شب روز کو اور صبح کتن شام کردن میں  
اُدے جو تھریں میں مرے نیکوہ ساقی  
اک دم میں خون کے خمیں انام کردن میں  
مجھ کو شبہ عالم کیا اس رتبے نہ کیونکر  
اللہ کا شکر ادا کر ام کردن میں

(۳)

آنکھوں میں ہر تصویر صورت کا، دلربا کی  
دل میں ادا کبھی ہر اس ناز میں ادا کی  
غنج دین وہ میرا بولے ہے کب کسی سے  
اُنے جو ہیں اشارت ہونٹھوں میں مسکراہ کی  
آئینہ پانی پانی کیونکر نہ شرم سے ہو...  
دیکھی ہے اُنے خوبی تجھ حُسن با صفا کی  
تیرے لب و دہن کی حسرت ہر آنکھ و  
کرتے ہیں کیا قیامت شاعر جو کہ میں نسبت  
تجھ خوشخرام قد سے سرو شکستہ پا کی  
باندھا جو بند تم نے میں اسے نگاہ سمجھا  
کر کے بہاؤ پر پابندش لگی حسنا کی  
غارت کیا دل و دین چشم سیر نے اُنکی  
ہے تو نیا جو کسے، تقصیر تو تیا کی  
میں چاہوں مگر پیار سے تم اور لگاؤ  
غمدہ برائی کس سے، ہوا ایسے افتر کی

روشن جہان نہ رہا اے آفتاب عالم!

عالم کی جان! میں نے تجھ کو یہی دعا کی

ذیل کے اشعار وہ اشک خورین میں جو شاعر کی چٹان کو رکے بجائے اسکے دل سے بہو کے قطرے  
بنکر چکے تھے، ایسی ہی ایک نظم اردو میں بھی ہے،

صرصر حادہ بر فراست پے خوار تھی ما  
داد بردار سرد برگ جہان داری ما

آفتاب فلک رفعت نشا ہی بودیم  
بروز در شام زوال آہ سید کاری ما  
چشم ما کند شد از دست فلک بہتر شد  
تا نہ بینیم کہ کند غیر جہان داری ما  
داد افغان بچہ شوکت شاہی برباد  
کیست جز ذات مبرا کہ کند یاری ما  
بود جہان کاہ زرد مال جہان ہجوم رض  
دفع از فضل الہی شدہ بیمار یی ما  
کر دہ بودیم گناہے کہ سزائش دیدیم  
ہست مصروف کہ بخشند گناہے گاری ما  
کر دہ سی سال نظارت کہ مراد اویاد  
زود تر یافتہ پادشاستم گاری ما  
عہد و پیمان بہ میان داد نمودند دعا  
مخلصان خوب نمودند وفاداری ما  
شیر و آدم افنی جپہ را پروردوم  
عاقبت گشت مجوز گرفتاری ما  
حق طفلان کہ بہ سی سال فراہم کردیم  
کردہ تاراج و نمودند سبکساری ما  
قوم مغلیہ و افغان ہمہ با زنی دادند  
لکہ گشتند مجوز بہ گرفتاری ما  
این گدازادہ ہمدان کہ بہ دوزخ برد  
بانی جور دستم شد بدل انگاری ما  
گل محمد کہ دروان بہ شرارت کم نیست  
چہ قدر کرد و کالت پے آزاری ما  
نامراد و سلیمان و بدل بیگ لعین  
ہر سہ بستند کمر بہر گرفتاری ما  
شاہ تیمور کہ دار و سر نسبت بہن  
زود باشد کہ بیاید بہ مدد گاری ما  
مادھو جی سیندھیہ فرزند جگر بند من است  
ہست مصروف تلافی ستم گاری ما  
آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند  
چہ عجب گر بنایند مدد گاری ما  
راجہ دراد و زمیندار امیر و چہ فقیر  
حیث باشد کہ نسا زند بہ غمخواری ما  
نازنینان پری چہرہ کہ ہمدم بودند  
نیست جز محل مبارک بہ پرستاری ما  
گر چہ ما از فلک امروز حوادث دیدیم  
باز فردا ہدایت دسر سرداری ما



## مکتوبات عالیہ

**زینت آسمان**، مؤلفہ پروفیسر برکت علی صاحب ایم اے بی ایس سی و پروفیسر منہاج الدین صاحب بی اے ایم اس سی، یہ فن ہنریت میں ہے اس میں خط پنجاب و شمال ہند کو طوطا رنگر انگریزی میں کی ترتیب پر ستاروں کے بارہ نقشے دیئے گئے ہیں، جنکے ذریعہ سے ہر ماہ میں نظر آنے والے ستارے پہچانے جاسکتے ہیں اور نصف النہار کے ارد گرد جو مجمع النجوم ہیں انکی ہر نقشہ کے مقابل کے صفوں پر تشریح و توضیح بھی لکھی ہے یہ امر قابل مسرت ہے کہ ستاروں کے لیے وہی نام منتخب کئے گئے ہیں جو عربی علم ہنریت میں ہیں عبارت صاف اور طرز بیان سلجھا ہے ان علوم پر ہماری زبان میں شاذ و نادر ہی کتابیں لکھی جاتی ہیں اس لیے مولفین ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں اور ہمدردان اور دو کو انکی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے، تقطیع کلان جسم ۳۲ صفحہ، کتابت و طباعت اچھی ہے، کاغذ متوسط درجہ کا ہے مولفین سے اسلامیہ کالج پشاور کے پتہ سے مل سکتی ہے،

## سبزی ترکاری

مصنفہ جناب غلام محمد خان صاحب ایل، اے جی لکچر گر کچل کالج اول پور، جناب مصنف نے فن زراعت پر اپنی تصنیفات کا سلسلہ جاری کیا ہے یہ اس سلسلہ کا دوسرا نمبر ہے اس میں مختلف ترکاریوں میں سے ہر ترکاری کے متعلق مستقل باب قائم کر کے ہر ایک کے متعلق نوعیت زمین، وقت کاشت، طریقہ کاشت وغیرہ بتائے ہیں، جناب مصنف اداۓ مفہوم میں ایک حد کا مہاب ہوئے ہیں لیکن کتاب کے اکثر مقامات پر فن زراعت کی ہندوستانی یا پنجابی بہت سی اصطلاحیں آگئی ہیں ضرورت تھی کہ ان کی توضیح میں یا مائشہ پر تشریح کر دی جاتی، یا آخرین تشریحی فہرست برصغاری جاتی، تاکہ عام لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے، چھوٹی تقطیع حجم ۱۰۰ صفحہ، کاغذ معمولی ہے مصنف سے پنجاب

اگر کچل کالج لائل پور کے پتہ سے طلب کیجاسکتی ہے،

**نالہ مشیر و کلام مشیر**، یہ دونوں جناب شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹر کے کلام کے مجموعہ ہیں نالہ مشیر کی اکثر غزلیں خطہ کشمیر کی سیر و تفریح کے وقت قلم سے نکلی ہیں اس لیے ان میں قدرتی مناظر اور ان سے لطف اندوزی کی جھلک فطری طور پر بہت زیادہ نمایاں ہے، ابتداء میں جناب قدوائی صاحب کا اڈیٹر صاحبان نظر کے نام بھیجا ہوا ایک طویل خط بھی منسلک ہے جس میں کشمیر کے فطری مناظر کا خاکہ کھینچا ہے اور دوسرے مجموعہ "کلام مشیر" کی اکثر غزلیں وطن سے دور افتادہ سرزمین یورپ میں بیٹھکر لکھی گئی ہیں، اس لیے وطنیت کے جذبات نمایاں ہیں اور چونکہ اسکی اکثر غزلیں اس وقت کی ہیں جب کہ دنیا میں جنگ کا دار و گیر جنگ برپا تھا اس لیے محبت اسلام و خدمت اسلام کی انگلیں بھی نظر آتی ہیں، شیخ صاحب "اتحاد ہند" تحریک کے مشہور مبلغ ہیں اس لیے بھی یہ چیزیں ان کے کلام میں ہونی چاہئے، شیخ صاحب طبعاً شاعر نہیں ہیں اس لیے شاعری کے محاسن و معائب سے قطع نظر کر کے ان کے خیالات سے فائدہ اٹھانا چاہئے مقامت علی الترتیب ۱۹۲۸ء، تقطیع چھوٹی کاغذ معمولی اور کتابت و طباعت متوسط درجہ کی ہے پتہ: جناب شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹرایٹ لاگدیہ ضلع بارہ بنگی،

## پیمان وفا

جناب ایم اے اہم صاحب نے تاریخی واقعات بچوں کے پڑھنے کے لائق قصہ کے پیرایہ میں لکھنا شروع کیا ہے یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، پیمان وفا کا قصہ سبق آموز اور دلچسپ، طرز ادب بھی صاف ہے، لیکن جناب مولف کو زبان کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے، جیسا کہ "ساربان" پر تبصرہ کرتے ہوئے توجہ دلائی جا چکی ہے، خصوصاً "نے" کا استعمال بہت زیادہ قابل ملاحظہ ہے، مثلاً "عالیشان مکان اس نے" "رہائش کے لیے بنوائے" "ہوئے" "تھے" "جن میں لوگوں نے" ان کھیلوں میں خاص طور پر شریک ہو کر حصہ لینا "ہوتا" "بادشاہ نے" "درباری سفید لباس" پہنا ہوا تھا،

حجم ۳۶ صفحہ کاغذ اچھا ہے، کتابت و طباعت متوسط ہے قیمت ۵ روپے، نسیم بک ڈپو بازار بارہ بنگی



روزنامہ، یہ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب کے روزنامہ کا گویا دوسرا حصہ ہے، دسمبر ۱۹۲۲ء سے دسمبر ۱۹۲۳ء تک کے سوانح و حالات پر مشتمل ہے، جنہیں زیادہ تر خانگی اور پرائیویٹ حالات ہیں، تاہم اس سے خواجہ صاحب کی پبلک لائف کا بھی بخوبی سا خاکہ کھینچا ہے اور ان کے مذہبی معتقدات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں خواجہ صاحب کے خواب جنہیں سے اکثر "مذہبی" اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں، وہ بہت زیادہ دلچسپ ہیں، روزانہ حالات کے بیان میں بہت سے اشخاص کے تذکرے بھی آگئے ہیں، جو آئندہ تاریخ نویس کو مدد دینگے۔ ضخامت ۴۴۴ معارف سائز کا غد معمولی، سرورق بیل بوٹیوں سے آراستہ ہے قیمت عکارتہ حلقہ مشیخ پکڑو

**سفرنامہ مظہری**، جناب مظہر عظیم صاحب انصاری رود دہلوی مرحوم چودہ برس تک آل انڈیا ٹیچنگ کونسل کانسٹنٹل اور انجمن ترقی اردو کے عہدہ سفارت پر مامور رہ چکے تھے، اس تقریباً ان کو تمام ہندوستان کے دورہ کا موقع ملا تھا اور مسلمان شرفاء اور قصبات کو انھوں نے دیکھا تھا، وہ اپنی یادداشت لکھتے جاتے تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے برادر کرم جناب مولوی محمد عظیم صاحب انصاری سترجم تاریخ عرب نے ان کے روزناموں کو منتخب کر کے "سفرنامہ مظہری" کے نام سے شائع کیا ہے، اس سفرنامہ میں حیدرآباد، اودھ، بہار اور صوبہ بنگال کے سفر کے حالات ہیں، سفرنامہ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم جن جن شہر اور قصبوں میں گئے ان کی طویل فہرست، معرزمین سے ملاقات اور نہان نوازی کے حالات پر اکتفا کرنے کی بجائے اس میں وہاں کی جزئی تاریخ، علمی، اقتصادی، تعلیمی اور معاشرتی حالات پر گہری نظر ڈالی ہے، اور ہر شہر و قصبہ کے ممتاز اشخاص کے حالات بھی قلمبند کیے ہیں اسلئے اس سفرنامہ میں موجودہ اسلامی ہندوستان کے اکثر صوبوں کی جو بہو تصویر نظر آتی ہے، آئندہ موصغ کے لیے یہ کتاب بیش قیمت اعلیٰ ہوگی، آج بھی اسلامی ہندوستان کو جاننے کے لئے یہ عجیب سرمایہ ہے۔ ضخامت ۴۴۴ معارف سائز کا غد معمولی اور کتابت و طباعت متوسط ہے، قیمت عکارتہ جناب مولوی محمد عظیم صاحب انصاری ناظم و بنیات مسلم ہوسٹل یونیورسٹی آلاہاد

دو آئندہ ہس پرائج کے معارف میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، پتہ کا اندراج باقی رہ گیا تھا، وہ یہ ہے: پروفیسر شیخ

محمد علی لدین صاحب

## جلد شانزدہم ماہ صفر ۱۳۴۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۲۵ء، عدد سوم

مضامین

۲۶۵-۲۶۲	سید سلیمان ندوی	تذکرات
۲۶۶-۲۶۴	"	عالم اسلامی کی تنظیم
۱۹۱-۱۷۷	پروفیسر محمد عبدالعزیز صاحب	ابوالعلماء عمر کے متعلق مستشرقین یورپ کی غلطیاں
۲۰۶-۱۹۲	پیشی احمد بیان جوناگڑھی	صاعداندلسی
۲۱۵-۲۰۷	جناب عبدالباسط صاحب	فلسفہ تمدن اور اسلام
۲۱۹-۲۱۶	"	عرب کی موجودہ حالت پر ایک علمی مجلس میں مذاکرہ
۲۲۱-۲۱۹	"	فلسفہ تاریخ عثمانی
۲۲۱-۲۲۱	"	لفظ جوہلی
۲۲۵-۲۲۲	"	اخبار علمیہ
۲۳۸-۲۲۶	پروفیسر محمد اکبر صاحب	کالیداس
۲۳۲-۲۲۹	سید سلیمان ندوی	سیر المصنفین
۲۳۴-۲۳۲	حافظ احمد علی صاحب ناظم امپورسٹ لائبریری	مکاتبات و مراسلا فارسی الیٹ انڈیا بمبئی
۲۳۷-۲۳۷	مولوی سید ہاشم صاحب ندوی	کتاب الماثور
۲۴۰-۲۳۸	"	مطبوعات جدیدہ